باب 7

آزاد کشمیر میں عملی زندگی

آزاد کشمیر میں میرا پہلا مقدمہ

ایک روز ہمارے کچھ رشتہ دار مظفرآباد کے قریب باغ نصف کر دلہ اپنے الاٹ شدہ متروکہ اراضی کا کیس لے کر میرے پاس آئے اور مجھ سے مشورہ طلب کیا۔ چوں کہ میں یہاں کے قانون سے واقف نہیں تھا، میں نے ان کو متعلقہ قانون یعنی بحالیات اور متروکہ اراضی کا ایکٹ لانے کو کہا۔ مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ تقریباً وہی ہے جو کشمیر میں نافذ العمل ہے جس کو یہاں مسلمان بنایا گیا ہے۔ آزاد کشمیر میں متروکہ اراضی کی قانونی حیثیت پاکستان کے باقی صوبوں کے مغائر ہے۔ پاکستان میں متروکہ اراضی مہاجرین کو کلیم میں بطور ملکیت دی گئی ہے جبکہ یہاں اس اراضی کی ملکیت تارک وطن کے نام ہی درج رہتی ہے، البتہ استعمال کی خاطر مختلف کیٹگری کے لوگوں کے نام الاٹ کی جاسکتی ہے جس کی ایک حد مقرر ہے۔ 1980 کی دہائی میں اتنا فرق پڑا کہ الاٹی عبوری حقوق ملکیت حاصل کر کے اس کو منتقل کر سکتا ہے لیکن اصل مالک کے حقوق بحال رہتے ہیں۔ یہ محض اشک شوئی ہے، ورنہ عملاً ملکیت بن گئی ہے۔

ان لوگوں کا معاملہ یہ تھا کہ ان کے نام الاٹ اراضی کی واپسی کے لیے ہندو مالکان اراضی کے ایک وارث نے ایکٹ بحالیات کی دفعہ 23 کے تحت سرٹیفکیٹ واپسی جائیداد لیا تھا اور اس کی بنیاد

107

پر الاٹمنٹ کی منسوخی اور قبضہ لینے کی کارروائی ہو رہی تھی۔ ہمارے لوگوں نے ڈپٹی کمشنر جو ایکٹ بحالیات کے تحت ڈپٹی کمشنر بحالیات بھی ہوتا ہے اسی کو سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا اختیار ہے، کے پاس اس سرٹیفکیٹ کی منسوخی کے لیے نظر ثانی کی درخواست دائر کی تھی۔ میں ان کی جانب سے مختار نامہ لے کر عدالت میں پیش ہوا جبکہ دوسری جانب سے اس وقت کے مشہور اور لائق ترین وکیل خواجہ بشیر احمد فاروقی اور خواجہ امیر الدین مرحومین تھے۔ چوں کہ میں سرحد کے اس پار سے آیا تھا اور ایسا پہلا شخص تھا جو بغیر پاکستانی شہریت یا سکونت کے ایک قانونی نقطہ پر بحث کے لیے مختار کی حیثیت سے پیش ہو رہا تھا۔ مظفرآباد کے اکثر وکیل بھی ہمیں سننے اور دیکھنے کے لیے احاطہ کچہری اور کورٹ روم میں جمع ہو گئے۔ مقدمہ کے فریقین کی پشت پر ایک دوسرے کے مضبوط سیاسی مخالفین بھی تھے، اس لیے یہ اہم سیاسی اور قانونی نوعیت کا کیس تھا جس میں لوگ بہت دلچسپی لے رہے تھے۔

میں نے یہ دلیل دی کہ دفعہ 23 کے تحت صرف ترک سکونت کرنے والا شخص یا اس کا وارث یکم جنوری 1953 سے قبل درخواست دائر کرنے کا استحقاق رکھتا ہے۔ دوسری جانب سرٹیفکیٹ لینے والوں نے اس کے لیے درخواست 1975 میں اس بنیاد پر دائر کی ہے کہ اصل مالک دورانِ شورش 1947 اسی گاؤں میں مارے گئے تھے جو تارکِ وطن کی تعریف میں نہیں آتے اور درخواست بھی اندر میعاد نہیں ہے۔ یہ لوگ زیادہ سے زیادہ دفعہ 22 ایکٹ انصرام جائیداد کے تحت کسٹوڈین سے اس امر کا ڈیکلیریشن لے سکتے ہیں کہ یہ زمین کے مالکان کے وارث ہیں۔

ڈپٹی کمشنر محمد اقبال قریشی صاحب تھے جو اپنے وقت کے بہت ہی دبنگ، باجرأت، بے خوف اور دیانت دار شخص تھے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔ وہ میری بحث سن کر بہت خوش ہوئے۔ مخالف وکیلوں کے جواب دینے سے پہلے ہی انہوں نے ان سے کہا کہ اس میں کیا غلط بات ہے۔ وکیل صاحب نے آپ کو متبادل فورم بھی بتا دیا ہے۔ ان لوگوں سے میری بات کے جواب میں کوئی بات نہ بن پائی اور محض یہ دلیل دی کہ بالآخر بھی یہی ہونا ہے کہ مالکان کو قبضہ ملے گا، خواہ دفعہ 23 کی درخواست پر ہو یا دفعہ 22 کے ڈیکلریشن پر جو لمبا پراسس ہے۔ اس لیے مختصر پراسس ہی فریقین کی

بہتری کے لیے اپنایا جائے۔ اس پر بھی میں نے کہا کہ کسٹوڈین جائیداد متروکہ کے بارے میں حتمی اتھارٹی ہے جبکہ ڈپٹی کمشنر کے سرٹیفکیٹ کے بعد ڈپٹی کسٹوڈین سے ہوتا ہوا پھر بھی کسٹوڈین نے ہی معاملہ کو حتمی کرنا ہے، اس لیے یہ دلیل بے وزن ہے۔

خواجہ امیر الدین مرحوم نے غصے میں کہا کہ اگر اندرا گاندھی کے ایجنٹوں کو کھلی چھٹی دی گئی تو یہ آزاد کشمیر میں افراتفری پھیلا دیں گے۔ اسی قسم کی کوئی بات مرحوم فاروقی صاحب نے بھی مہذب طریقہ سے کی۔ اس پر اقبال قریشی صاحب ان دونوں پر برس پڑے اور کہا کہ آپ کو پہلی بار کسی وکیل سے واسطہ پڑا ہے تو آپ دلیل اور قانون کی بجائے ذاتیات اور لچر پن پر اتر آئے ہیں۔ اس پر ان کے اور ڈپٹی کمشنر کے درمیان تلخی شروع ہوگئی جس پر دونوں وکلاء ان کو دھمکیاں دینے لگے جس کے جواب میں انہوں نے غیر پارلیمانی زبان اور ہندکو میں کہا، ''میرا جے کج پٹنا پٹ کنو۔'' مخالف وکلا کے طرزِ عمل اور مجھ پر ذاتی فقرے کسنے پر وہاں پر موجود وکلا اور لوگوں نے بہت برا منایا اور سب نے مجھ سے معذرت کی۔

قریشی صاحب نے مجھے اپنے چیمبر میں بلا لیا اور کہا کہ میں آپ کا ہمسایہ ہوں۔ آپ کا سنا تھا لیکن میں کسی کو ملنے نہیں جایا کرتا، اس لیے آپ کو نہیں ملا۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ آپ ایسے ہیں تو میں آپ کے چار مہینے ضائع نہیں ہونے دیتا اور آپ کو وکالت کرنے پر مجبور کر دیا ہوتا۔ اب آپ نے واپس کشمیر نہیں جانا۔ ان کے ساتھ اس وقت سابق ڈپٹی کمشنر چوہدری عبدالرشید بھی تھے، انہوں نے بھی کہا کہ آپ کو ہم کسی صورت واپس نہیں جانے دیں گے، یہ ہمارے ملک کے وسیع مفاد میں ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان لوگوں کی باتوں کا برا نہ منائیں یہ لوگ جب دلیل کا جواب دلیل سے نہ دے سکیں تو گالی گلوچ پر اتر آتے ہیں۔ چوہدری صاحب بھی اس کے بعد میرے ساتھ بہت ہی شفقت سے پیش آتے رہے اور جب وہ میر پور ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے چیئرمین تھے تو انہوں نے وکلاء کے کوٹے سے میرے نام ایک پلاٹ بھی الاٹ کیا۔

اسی شام اقبال قریشی صاحب ہمارے گھر آئے جو بالکل ہمارے پڑوس میں رہتے تھے اور میرے دو چچا ان کے ماتحت کام بھی کرتے تھے۔ انہوں نے میرے والدین اور چچاگان کو میرے

واپس نہ جانے کے لیے اور بھی پکا کر دیا اور خود اس سارے معاملے کی دیکھ بھال کرتے رہے۔

چیف جسٹس محمد یوسف صراف اور وکالت کی ابتدا

اس زمانے میں آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خواجہ محمد یوسف صراف مرحوم تھے جو پاکستان کے نامور قانون دانوں میں سے تھے۔ تحریک آزادی کشمیر کے ہراول دستے میں شامل تھے اور تحریک پاکستان کے کارکن بھی رہے۔ بلا کے ذہین وفطین اور مضبوط اعصاب کے شخص اور سخت گیر جج تھے۔ میرے بارہمولہ میں ان کے خاندان والوں کے ساتھ کافی گہرے تعلقات تھے۔ پاکستان آتے وقت ان کی بہنوں نے ان کے لیے خطوط اور تحائف وغیرہ بھی بھیجے تھے۔ ادھر میری والدہ کے ان کی بیگم صاحبہ کے ساتھ کافی تعلقات تھے۔ صراف صاحب کی بہن، جو خواجہ حمید ممتاز صاحب، ریٹائرڈ سیکریٹری حکومت کی بیگم ہیں، کے ساتھ بھی میری والدہ کے اچھے تعلقات تھے کیوں کہ دونوں کشمیری بولنے والی خواتین تھیں۔ صراف صاحب مرحوم کو جب میرا پتا چلا تو انہوں نے بھی مجھے اپنے گھر بلایا۔ مرحوم اس زمانے میں کشمیر پر تاریخ لکھنے والی کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے کشمیر کی تاریخ لکھ رہے تھے۔ مجھ سے بھی انہوں نے میری یادداشتوں پر مبنی کشمیر کے واقعات کے بارے میں مدد چاہی مجھے جس قدر واقعات یاد تھے یا ان کے سوالات کے جوابات میں جو اطلاعات تھیں، وہ دیں۔ ان کی کشمیر پر مستند کتاب، Kashmiris Fight for Freedom دو والیمز میں چھپ چکی ہے۔ وہ شروع دن سے مجھے یہی مشورہ دے رہے تھے کہ میں واپس نہ جاؤں یہیں اپنے والدین کے پاس رہوں اور یہیں وکالت کروں۔ مرحوم کے الفاظ ہیں کہ

You will shine here but you will have to be strong nerved.

انہوں نے بھی چوہدری عبدالرشید صاحب کی طرح کہا کہ یہاں پر لوگ میرٹ پر نہیں بلکہ سازش کے ذریعہ مقابلہ کرتے ہیں لیکن you have to be steadfast عین ممکن ہے کہ میری والدہ نے ہی ان کو میرے اِدھر رہنے کے بارے میں آمادہ کرنے کو کہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ڈگری وغیرہ کے کاغذات مانگے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا، سوائے ایک اس سرٹیفکیٹ کے جو وہاں کے منصف

جوڈیشل مجسٹریٹ نے دیا تھا کہ میں وہاں ہائی کورٹ میں enrolled وکیل ہوں۔ یہ میں نے امیگریشن وغیرہ کے مقصد کے لیے رکھا تھا جو فی الواقع تعارفی سرٹیفکیٹ تھا جس پر To whom it may concern لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جب تک یہاں ہوں، بیکار نہ رہوں بلکہ پیشہ وکالت سے منسلک رہوں۔ مجھے ان کی یہ بات پسند آئی۔ انہوں نے مجھے اسی سرٹیفکیٹ پر پلیڈرشپ کا عبوری لائسنس جاری کر دیا۔ میں اس ارادے سے بار میں آنے جانے لگا کہ وقت آسانی سے کٹ جائے گا اور جب والدین مانیں گے تو میں واپس چلا جاؤں گا لیکن کاتب تقدیر نے مجھے کہاں جانے دینا تھا بلکہ انتہائی غیر محسوس طریقے سے یہاں کی سماجی اور سیاسی زندگی کا بتدریج حصہ بنا دیا اور اس کے لیے قدرت خود بخود راستہ ہموار کرتی گئی۔ میرا یہاں کے پڑھے لکھے اور بااثر لوگوں سے رابطہ ہوا اور میں بار روم میں آتا جاتا رہا۔ مختار نامہ پر مقدمہ کی پیروی کے دوران شہرت پانا' مجسٹریٹ کے سرٹیفکیٹ کا ساتھ ہونا ایک کشمیری النسل چیف جسٹس کا ہونا ہمارے ان کے ساتھ تعلقات، والدین اور عزیزوں کی ضد ایسے اسباب تھے جنہوں نے مجھے یہاں کی زندگی کا حصہ بنا دیا۔ بہت ہی حسب الحال حدیث ہے کہ ''پانی کی قید لوہے کی قید سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔'' جو لوگ مجھے مختار نامہ پر مقدمہ کی پیروی کے لیے کہتے تھے، ان کو ایک وکیل مل گیا اور وکیل کو زندگی جینے کا بہترین مصرف۔

فبای الا ربکما تکذبان

اس وقت مظفرآباد میں خواجہ بشیر احمد فاروقی مرحوم، خواجہ امیر الدین مرحوم، سید غلام حسین شاہ بیتاب، سید تصدق حسین شاہ مرحوم اور خواجہ محمد سعید ریٹائرڈ چیف جسٹس سپریم کورٹ، وکالت میں بڑے اور معروف تھے۔ اوّل الذکر کو تو میں دیکھ چکا تھا، البتہ دیگر دو حضرات کے ساتھ بات کرنے کا موقع تو ملتا تھا لیکن کام کرنے یا آمنے سامنے ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ خواجہ محمد سعید صاحب کو میں نے ایک دن سیشن جج کی عدالت میں بحث کرتے سنا جس کے مدمقابل تصدق شاہ صاحب مرحوم تھے۔ بشیر احمد فاروقی اور سید غلام حسین شاہ بیتاب سے میری ان کے گھر پر ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں ذہین لوگ تھے اور ظرافت ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ بھائی، بچوں اور دوستوں جیسا سلوک تھا۔ بیتاب شاعر اور بلا

107

کے شکاری بھی تھے بے حد منظم آدمی تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ خواجہ بشیر فاروقی، سید تصدق حسین شاہ مرحوم یا سید غلام حسین شاہ بیتاب، کے ساتھ کچھ دن کام کیا جائے۔ تینوں کے چیمبرز میں ان کی اجازت سے چند دن جاتا رہا۔ لیکن زیادہ عرصہ بیتاب صاحب کے ساتھ رہا۔ سول اور کریمنل پروسیجر کوڈ' قانون شہادت' مال گزاری' معاہدات' میراث اور ازدواج کے قوانین کے بارے میں مَیں نے ان سے آگاہی حاصل کی۔ ان لوگوں کے ساتھ بات کر کے معلوم ہوا کہ یہاں بھی لیگل سسٹم وہی ہے کیوں کہ وہی قوانین اور ضابطے یہاں بھی نافذ ہیں جو ریاست کے اس حصے میں ہیں۔ ادھر رنبیر پینل کوڈ اور ادھر آزاد پینل کوڈ کہتے ہیں۔ غرض یہ کہ چند قوانین کو نئے ناموں سے موسوم کیا تھا، باقی نام بھی وہی تھے۔

مقبوضہ کشمیر کی طرح مظفرآباد میں بھی مجھے اسی نوعیت کا ایک کیس یعنی 107/151 کا ملا جس میں ضمانت کی درخواست زیر ساعت تھی، مقدمہ ایڈیشنل سب جج سردار محمد اشرف کی عدالت میں زیر ساعت تھا۔ میں مستغیث کی جانب سے وکیل پیش ہوا اور اعتراض کیا کہ اس مقدمہ کی ساعت کا اختیار اس عدالت کو حاصل نہیں بلکہ ایگزیکٹو مجسٹریٹ کو حاصل ہے۔ اس پر عدالت میں موجود سب لوگ ہنس پڑے اور جج صاحب نے بھی مجھے طنزاً کہا کہ آپ نے سات سال کہاں جھک ماری ہے؟ یہ صاحب بعد میں شریعت کورٹ کے جج ریٹائر ہوئے اور ایک نیک نام جج کے طور جانے جاتے ہیں۔ میں نے جب ان کو اپنا نقطہ نظر سمجھایا تو عدالت میں موجود ایک سینئر وکیل بشیر احمد فاروقی مرحوم اٹھے اور کہا کہ ''جس ملک سے یہ شخص آیا ہے، وہاں عدلیہ انتظامیہ سے علاحدہ ہے، اس لیے اس نے درست اعتراض کیا ہے۔'' پھر میری طرف رخ کرتے ہوئے کہا کہ ''برخوردار یہاں سب چلتا ہے۔'' یہ ڈوگرہ عہد میں پولیس پراسیکیوٹر اور غالباً اسی زمانہ میں منصف مقرر ہو کر آزاد کشمیر میں سب جج کے طور ریٹائرڈ ہو گئے تھے۔ پیپلز پارٹی اور بھٹو صاحب کے بہت مخالف تھے اور جن وکلا اور جج نے میرا مذاق اڑایا تھا یہ لوگ پیپلز پارٹی اور بھٹو صاحب کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ فاروقی صاحب مرحوم نے ان کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہا کہ یہاں منتخب وزیر اعظم بھی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن سکتا ہے تو سب جج ایگزیکٹو مجسٹریٹ کیوں نہیں ہو سکتا؟

آزاد کشمیر کے عدالتی، قانونی اور انتظامی نظام سے آگاہی کے بعد میں نے ہٹیاں کے سول کورٹ میں کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے سے ہمارا علاقہ کرناہ وابستہ تھا جہاں میرا خاندانی اثر ورسوخ تھا اور ادھر مقابلہ بھی سخت نہیں تھا۔ میں کچھ عرصہ وہاں رہا لیکن طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ مقابلہ کوئی نہیں تھا اور بغیر کانٹے دار مقابلے کے زندگی کا مزا نہیں آتا۔ اللہ نے مدد کی اور منظور احمد میر مرحوم جو اس وقت مظفر آباد میں افسر مال تھے، نے میرا تعارف اس وقت کے جائیداد متروکہ کے کسٹوڈین سردار آفتاب خان مرحوم سے کرایا جنہوں نے مجھے پیشکش کی کہ اگر میں چاہوں تو وہ مجھے پانچ صد روپے ماہوار پر محکمہ بحالیات کا وکیل مقرر کر دیں گے۔ میں نے فوراً حامی بھر لی کیوں کہ میں مظفر آباد رہنا چاہتا تھا۔ ہٹیاں میں پیسے تو بہت کما لیتا تھا لیکن ہر روز ادھر آنا جانا، سفر کی صعوبتیں اور بور زندگی مجھے پسند نہ تھی۔ مظفر آباد اس سے قدرے وسیع فیلڈ تھا۔ مختلف عدالتیں تھیں، بہت سے وکیل تھے۔ ریاستی صدر مقام اور مدنی زندگی تھی۔ بے ارادہ اور نہ چاہتے ہوئے بھی ادھر میری وکالت چند دنوں میں جم گئی اور چند ہی دنوں میں میں یہاں کی اگلی صفوں کے وکیلوں میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے بہت حوصلہ ملا اور محسوس کرنے لگا کہ میں اچھی جگہ پر آ گیا ہوں جہاں مجھے نام کمانے اور مقام بنانے کا موقع ملے گا۔ میں طبعی طور اس طرف مائل ہونے لگا کہ مجھے یہیں رہنا چاہیے۔

میں نے اپنی بیوی کو اعتماد میں لینا شروع کیا جس نے اس شرط پر حامی بھری کہ اگر ادھر رہنا ہے تو اپنا الگ مکان لے کر رہیں کیوں کہ ہم سب لوگ ایک دوسرے کے لیے نامناسب تھے۔ ہماری ذاتی اور سماجی زندگی کی عادتیں اس وقت ایسی تھیں جیسی یہاں کے لوگوں کی اب ہوئی ہیں۔ مجھے لگا جیسے وہاں کے معاشرے میں یہاں کے مقابلے میں زیادہ کشادگی ہے۔ اس کی وجہ جمہوری سسٹم، وسیع و عریض ملک اور بھانت بھانت کے رنگ ونسل کے لوگوں کے ساتھ انٹرایکشن اور مقابلہ، میڈیا کی آزادی اور سیکولر سسٹم وغیرہ ہے۔ انسانی سوچ معاشرہ کے طرزِ فکر کی عکاس ہوتی ہے۔ اس علاقہ میں علاقائی اور قبیلائی تعصب، محض ایک کمیونٹی میں رہ کر کسی اور طرزِ فکر سے ناآگہی، میرٹ گریزی اور جتھا بندی کے ذریعہ مناصب کے حصول نے لوگوں کی سوچ پر پہرے بٹھائے ہوئے ہیں۔ اب تو زمین

107

اور آسمان کا فرق ہے۔ میڈیا کی آزادی نے لوگوں کو فکر اور سوچ کی دعوت دی ہے۔ ذہنی دریچے کھل گئے ہیں، مقابلے کا رجحان پیدا ہونے لگا ہے۔ البتہ قبیلہ اور علاقہ پرستی کی لعنت سے فی الوقت چھٹکارا نہیں پایا جا سکا۔ اگر تعلیم عام ہو گئی، مقابلے کا رجحان بڑھ گیا، معاشی اور پیداواری سرگرمیوں کو پرائیویٹ سیکٹر میں دیا گیا اور فری ٹریڈ کا رجحان بڑھتا گیا تو یقیناً میرٹ کی بالادستی شروع ہو جائے گی جس سے جواب دہی کا عمل بھی جاری ہو جائے گا۔ اسی صورت میں یہ قبیلائی اور علاقائی لعنتیں از خود دم توڑ دیں گی۔ اب دنیا اس طرف بڑھ رہی ہے اور ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑے گا۔

میں نے اپنی بیوی کی رائے کو پسند کیا اور فوراً مکان کی تلاش میں لگ گیا۔ ساتھ ہی میں نے کشمیر سے اپنے سرٹیفکیٹ بھی منگوا لیے جن میں بی اے اور ایل ایل بی کے سرٹیفکیٹ تھے۔ مجھے صراف صاحب نے سرٹیفکیٹ آنے پر ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کا لائسنس جاری کر دیا اس سے میرے حوصلے اور بلند ہو گئے۔ کچھ دن بعد میری ملاقات سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رحیم داد خان سے ہوئی۔ مرحوم بہت ہی حلیم اور مہمان نواز شخص تھے۔ انہوں نے رخصت کرتے وقت مجھے کہا کہ میں سپریم کورٹ کے لائسنس کے لیے بھی درخواست دوں۔ میں نے قواعد دیکھے لیکن ان کے تحت میں کوالیفائی نہیں کرتا تھا کیوں کہ اس کے لیے ہائی کورٹ کی پانچ سال کی پریکٹس لازم ہوتی ہے۔ چوہدری صاحب نے رجسٹرار کے ذریعے مجھے دوبارہ پیغام بھیجا جس کو میں نے یہی جواب دیا۔ لیکن چیف جسٹس صاحب نے کہا کہ چیف جسٹس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی بھی اہل شخص کو پانچ سال کی مدت کے بغیر بھی لائسنس جاری کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہائی کورٹ کی ایک سال کی کم مدت کے باوجود مجھے سپریم کورٹ کا وکیل اِنرول کیا گیا۔ اللہ ان کو جنت نصیب کرے۔ آمین۔

اس وقت میری ایک پھوپھی، داؤد صاحب کی والدہ جو بہت دیدہ ور خاتون تھیں، نے میری بہت حوصلہ افزائی کی انہوں نے ہمیں پلیٹ میں اپنے محلہ میں ایک مکان کی نشاندہی کروا دی۔ ہمیں ان کی وساطت سے تین سو روپے ماہوار پر تین کمروں کا مکان مل گیا۔ میرے ماں باپ اور بہن بھائیوں نے اس پر بہت شور مچایا کہ ہم نے ان کے خاندان میں تفریق اور انتشار پیدا کر کے ایک غلط روایت کی

بنیاد ڈالی ہے۔لیکن میں نے ان کو صرف ایک ہی بات کہی کہ میں محض آپ لوگوں کی ضد کی وجہ سے یہاں رہ رہا ہوں اور اگر میرا یہاں رہنا ناگزیر ہے تو میں اس طرح رہوں گا جس طرح میرے بچے بھی خوش رہیں اور ہمارے درمیان ٹکراؤ کی صورتِ حال بھی پیدا نہ ہو۔

بہر حال میں نے درست اور بروقت فیصلہ کر کے اپنے تعلقات اور حالات بحال کر لیے۔

مجھے بیوی بچوں کی طرف سے سکون، والدین کی طرف سے اطمینان، دیگر رشتہ داروں کی طرف سے پورا تعاون نصیب ہوا اور میں نے پوری دل جمعی سے وکالت شروع کر دی۔اس وقت اقبال قریشی صاحب جو کہ ڈپٹی کمشنر ضلع مظفرآباد تھے، نے حکومت پاکستان کو میرا پاسپورٹ سرنڈر کر کے مجھے یہاں رہنے کی اجازت کی سفارش بھی کی اور میرے حق میں مظفرآباد سے سٹیٹ سبجیکٹ سرٹیفکیٹ بھی جاری کیا۔میرا حلقہ احباب وسیع اور حوصلے بلند ہونے لگے میں نے اپنی لابی بنانا شروع کر دی اور بہت ہی جلدی آزاد کشمیر کے سیاسی زعما اور قانونی اور سرکاری حلقوں میں نمایاں ہو گیا۔

؎ افلاک کو مفتوح بنا لے بھلے انسان
تقدیر بڑی چیز ہے تدبیر کے آگے

اقبال قریشی صاحب نے بحیثیت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ آزاد کشمیر کے محکمہ داخلہ کے توسط سے حکومت پاکستان سے میرے آزاد کشمیر میں رہنے کی اجازت حاصل کی جس پر میرا ہندوستانی پاسپورٹ سرنڈر ہو کر وزارتِ داخلہ آزاد کشمیر نے کشمیر کونسل کی منظوری بھی حاصل کر کے مجھے آزاد کشمیر میں آباد ہونے کا نوٹیفکیشن جاری کیا۔حالاں کہ بحیثیت ریاستی باشندہ یہ میرا حق بھی تھا۔یہ اپنی نوعیت کا پہلا کیس تھا۔جج بننے کے بعد میں نے کئی فیصلے کیے جس کے تحت مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو آزاد کشمیر میں آباد ہونے کا ویسے ہی حق حاصل ہے، جیسا کہ آزاد کشمیر کے لوگوں کو جس کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔اس کا فائدہ 1990 کے بعد آنے والے ہزاروں لوگ بالخصوص مجاہدین اٹھا رہے ہیں۔کچھ عرصہ کرایہ کے مکان میں رہنے کے بعد میں نے مظفرآباد شہر کے محلہ پلیٹ میں اپنا مکان بنا لیا جس کے لیے زمین میرے والد صاحب کے نام پہلے سے ہی الاٹ تھی۔مکان تک پہنچنے کے لیے ایک تنگ گلی سے

107

پیدل گزرنا پڑتا تھا۔جو ہمسایہ آسانی سے اس کو کشادہ کر سکتا تھا، اس نے معاوضہ کی پیشکش کے باوجود جگہ دینے سے انکار کر دیا۔حالاں کہ اس حصہ زمین پر اس کا ناجائز قبضہ تھا لیکن وہ چوں کہ محکمہ مال میں تحصیلدار تھا اور اس کا بہنوئی ایک مذہبی جماعت کا امیر تھا۔میں نے اس میں الجھنے کی بجائے وہاں سے منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔1992 میں میں نے یہ مکان فروخت کر دیا اور خود شوکت لائن میں ایک کرایہ کے مکان میں سکونت اختیار کی اور بعد ازاں وہیں مکان بھی خرید لیا۔

اتفاقاً مجھے شوکت لائن میں وہ مکان ملا جس کے زیرِ تعمیر ہونے کے دوران میں نے خواہش کی تھی کہ میں خوش قسمت ہوتا اگر یہ مکان مجھے مل جائے۔قدرت سننے اور دینے والی ہے، اجابت کی گھڑی تھی۔1992 میں مظفرآباد میں بہت بڑا سیلاب آیا جس وجہ سے مالک مکان کا جس شخص کے ساتھ 26 لاکھ میں سودا ہوا تھا، اس نے مکان خریدنے سے انکار کر دیا۔میں نے مالک مکان خواجہ حمید اللہ جو سیکریٹری جنگلات تھے، کے ساتھ رابطہ کیا۔سیلاب کی وجہ سے کٹاؤ کا شکار ہونے کی بنا پر اس مکان کو کوئی خریدنے کا خطرہ مول نہیں لے رہا تھا جبکہ خواجہ صاحب سنجیدگی سے اس کا سودا کرنا چاہتے تھے۔ہمارا سودہ چودہ لاکھ میں طے ہو گیا۔ادھر میرے پلیٹ والے مکان کا سودا پندرہ لاکھ میں ہو گیا۔اس طرح مجھے میری خواہش کے مطابق برلب نیلم رہنے کے لیے خوبصورت ترین جگہ پر گھر مل گیا۔

اس وقت میری ڈیوٹی پر مامور ایک سپاہی محمد سلیم نے مجھے کہا کہ صاحب جی یہ مکان فوجی ایریا میں ہے، نہ لیں۔لیکن اس وقت مجھے یہی ایریا محفوظ اور اچھا لگا۔لیکن آج کے دہشت گردی کے دور میں فوجی ایریا ہی غیر محفوظ لگ رہا ہے۔یہ مکان عملاً فوجی چھاؤنی میں ہے۔

آزاد کشمیر میں فوجی حکومت اور چیف جسٹس صراف کا ٹرائل

پاکستان میں 1977 میں پیپلز پارٹی کی منتخب حکومت کو برطرف کر کے جنرل ضیاالحق مرحوم نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔اپنی ذات کو دوام دینے کے لیے اس نے نئے نظام کا غلغلہ شروع کرا دیا تھا۔نظام صلوٰۃ اور نظام زکوٰۃ اور پتا نہیں کیا کیا نظام رائج پذیر ہونے لگا۔سیاسی کارکنوں کی پکڑ دھکڑ شروع تھی اور

آزاد کشمیر میں بھی حکومت کو برطرف کر کے یہاں بھی ایک فوجی بریگیڈیئر محمد حیات خان کی 31 اکتوبر 1978 کو بطور منتظم اعلیٰ وصدر تقرری کی گئی اور سردار ابراہیم خان کو صدارت سے برطرف کیا گیا۔ یہ آزاد کشمیر میں تعمیر وترقی کے لحاظ سے مائی باپ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن مرکز کے ایجنڈے میں ڈنڈا بھی تھا، انہوں نے بھی وہی پکڑ دھکڑ شروع کی جو مرکز میں جمہوریت پسندوں کے ساتھ آمر کر رہا تھا۔

ادھر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صراف صاحب مرحوم نے عوامی حقوق کے مورچہ پر مکمل پہرہ داری رکھی تھی اور لوگوں کو مکمل انصاف فراہم ہو رہا تھا۔ اِدھر لوگ پکڑے گئے اور اُدھر ان کے مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے اور اکثر لوگوں کو شخصی مچلکہ پر رِہا کر دیا جاتا تھا۔ صراف صاحب نے تو کرنل منشا خان اور ممتاز راٹھور مرحوم وغیرہ کو محض ایک ایک روپے کے ذاتی مچلکہ پر چھوڑ دیا تھا اور ایمرجینسی پاور ایکٹ کو آئین کے مغائر قرار دے کر کالعدم بھی قرار دے دیا تھا۔ یہ بات جنرل حیات خان کو کسی طور پسند تھی اور نہ ہی ان کے مربی جنرل ضیاالحق مرحوم کو۔ چنانچہ صراف صاحب کو ہٹانے کے لیے ان کے خلاف بے بنیاد الزامات پر مبنی ایک لغو چارج شیٹ فائل کی گئی جو صدر نے ریفرنس کے طور سپریم جوڈیشل کونسل میں دائر کی۔

ان میں ایک مضحکہ خیز الزام یہ بھی تھا کہ انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے، تاہم اس کو ایک اور رنگ دے کر لکھا گیا۔ صراف صاحب اس لیے آسان ہدف بن گئے کہ ان کا تعلق وادیٔ کشمیر سے تھا اور ان کا یہاں سوائے Intellectualism کے اور کوئی حلقہ نہیں تھا۔ سردار عبدالقیوم خان بھی ان کے خلاف تھے جو اس وقت نمایاں اور مضبوط ترین لیڈر تھے کیوں کہ صراف صاحب نے ان کی نظر بندی کو جائز قرار دیا تھا۔ صراف صاحب کی ذہانت کے علاوہ' نظر بندوں کو رہائی والا کیس اور' ان کا کشمیر کی وادی سے ہونا ان کے عتاب کے لیے کافی تھا۔ اس معاملہ پر حکومت اپنی مجبوریوں اور سردار صاحب اپنی مصلحتوں کے تحت متفق تھے۔ میرے خلاف بھی 1993 میں کتاب لکھنے کا ایک لزام لگایا گیا تھا جیسے کہ کتاب لکھنا کوئی جرم ہو۔ اس کی تفصیل دوسری جگہ درج ہے۔

سپریم جوڈیشل کونسل کے اراکین میں چوہدری رحیم داد مرحوم چیف جسٹس سپریم کورٹ اور

سردار محمد شریف مرحوم چیف جسٹس ہائی کورٹ صراف صاحب کے ذاتی طور مخالف تھے۔ مخالفت کی وجہ محض صراف صاحب کی اہلیت، قابلیت، ذہانت، جرأت اور Initiative تھا۔ جب کسی کا مقابلہ ان چیزوں سے نہ ہو سکے تو سازشوں سے کیا جاتا ہے اور سازشی عناصر حکومت وقت کے گرد اگرد ایک ہالہ بنا کر اس کو یہ باور کروانے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ سوائے ان کے' سارے لوگ ان کے دشمن ہیں اور سوائے ان کے' ان کا کوئی بھی ہمدرد نہیں ہے جس کو ہدف بنانا ہوتا ہے اسی کو وطن دشمن کہہ کر Defensive کر دیا جاتا ہے اور فی الفور صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔ جب کسی شخص کے جائز کام سے اس کا مقابلہ ممکن نہ ہو اور بہت ساری طاقتیں اسے صفحہ ہستی سے مٹانے پر تلی ہوئی ہوں تو اس شخص کی کردار کشی کے لیے تمام منفی قوتیں متحد ہو کر منظم مہم شروع کر دیتی ہیں۔ تواتر سے جھوٹ گھڑ کر اس کو گھیر لیا جاتا ہے اور اس شخص کی تحقیر اور تمسخر اڑانے کے لیے عجیب وغریب قسم کے لطیفے اور اس کے بالمقابل کے لیے مصنوعی افسانوی کردار کے قصیدے گھڑے جاتے ہیں۔ اگر اس مہم کا اثر ہونا شروع ہو جائے تو اس کو دبوچ لیا جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کو بے توقیر کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ الا یہ کہ اس شخص کی مدافعانہ قوتیں متحد ہو جائیں۔ صراف صاحب مرحوم اس فتنے کا شکار ہو گئے اور بدقسمتی سے اپنے ہی ادارے کے لوگوں نے یہ کردار ادا کیا یہی سیاستدان چاہتے تھے۔ سردار شریف صاحب ذاتی طور اسم بامسمیٰ تھے اور کسی سازش کا حصہ نہیں بنتے تھے لیکن صراف صاحب کی شوخی طبع ان کو بھی پسند نہیں تھی جبکہ تیسرے ممبر ملک محمد اسلم یا راجہ محمد خورشید گنگا گیا گنگا رام، جمنا گیا جمنا داس والی بات تھی۔

کچھ کشمیری بولنے والے لوگوں نے اس صورتِ حال سے نکلنے کے لیے جنرل فیض علی چشتی سے ملاقات بھی کی جو اس وقت وزارتِ کشمیر کے انچارج وزیر بھی تھے۔ وفد میں' میں بھی شامل تھا اور وکلا میں سے میرے علاوہ خواجہ محمد سعید صاحب اور جسٹس خواجہ شہاد احمد ریٹائرڈ چیف جسٹس صاحبان بھی تھے۔ ریٹائر چیف جسٹس خواجہ سعید صاحب تو اپنی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہونے کا بہانہ بنا کر رفو چکر ہو گئے جبکہ شہاد صاحب وہاں پر چپ سادھ کر بیٹھ گئے۔ باقی لوگوں میں سے نمایاں خواجہ فقیر محمد اور خواجہ

محمود مرحوم تھے۔ میں وہاں پر بھرپور بولا لیکن اس کو اتنا متنفر کیا گیا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ الجھ پڑے بلکہ مجھے تو یہاں تک کہا کہ آپ کی باتوں سے ہندوستانی ہونے کی بو آتی ہے۔ میرا تعارف ان کو پہلے ہی کروا دیا گیا تھا۔ میں نے ان کے اس فقرے کے جواب میں ان کو ہنستے ہوئے کہا کہ ''آپ کے کاؤنٹر پارٹ ہندوستان میں ہم لوگوں کو ان ہی باتوں پر پاکستانی کہتے تھے۔''

صراف صاحب نے بالآخر استعفیٰ دے دیا لیکن ان کو بااین ہمہ توہین عدالت میں سزا دی گئی۔ سزا کی وجہ یہ بنی کہ چوہدری رحیم داد مرحوم نے طعنہ دیتے ہوئے صراف صاحب کو کہا کہ ہمارا المیہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے لوگوں کو بڑے بڑے مقام مل جاتے ہیں۔ اس پر صراف صاحب نے ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ درست کہتے ہیں کہ جب آپ جیسے چھوٹے چھوٹے لوگ اتنے بڑے منصب پر پہنچ جائیں تو یہ یقیناً المیہ ہے۔'' دونوں نے ایسی باتیں کر کے اپنے کردار کو داغ دار بنا دیا۔ ان کے خلاف گواہان کی فہرست میں ریٹائرڈ جسٹس چوہدری محمد تاج اور چیف جسٹس ریٹائرڈ چوہدری محمد ریاض اختر بھی تھے لیکن میرے خیال میں ان کے بیانات قلمبند ہونے سے پہلے ہی صراف صاحب نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ان کو سزا دے کر میرپور جیل بھیج دیا گیا جہاں قیدیوں کے ذریعہ ان کے ساتھ بدتمیزی کروائی گئی لیکن حکومت پاکستان نے عالمی دباؤ کے تحت تین دن کے بعد ہی ان کی سزا ختم کروا کر رہا کر دیا۔

آزاد کشمیر میں حکومت کی تبدیلی اور انتقامی کارروائی

1977 میں آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کی حکومت اور اسمبلی کو پاکستان میں مارشل لاء نافذ ہونے کے ساتھ ہی برطرف کر دیا گیا تھا۔ اسمبلی اور دیگر عہدیداروں کو برطرف کرنے کے لیے آزاد کشمیر کی پارلیمانی جماعتوں اور حکومت پاکستان کے درمیان باضابطہ ایک تحریری معاہدہ ہوا جس میں طے کیا گیا کہ پاکستان میں الیکشن منعقد ہونے کے نوے دن کے اندر اندر آزاد کشمیر میں بھی الیکشن ہوں گے۔ آزاد کشمیر حکومت کے سارے اختیارات آئین میں دفعہ 53 الف کے عارضی اضافے کے

ذریعے' جو جوائنٹ سٹنگ میں پاس ہوا'[107] ایک منتظم اعلیٰ کو سپرد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ پہلے جنرل عبدالرحمن اور پھر بریگیڈیئر حیات خان کو آزاد کشمیر کا منتظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ پہلے تو آزاد کشمیر کے صدر مرحوم سردار محمد ابراہیم خان کو اپنے عہدہ پر بحال رکھا گیا لیکن بعد ازاں ان کو بھی برطرف کر کے صدر کے اختیارات بھی منتظم اعلیٰ کو منتقل کیے گئے۔ اس کے علاوہ جملہ حکومتی اختیارات کا منبع، سوائے عدالتی اختیارات کے، صدر کو قرار دیا گیا۔ پارلیمانی پارٹیوں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑا مار کر آئین میں آمر کی راہ ہموار کی البتہ آئین کو بچا لیا۔ اس طرح ماسوائے پارلیمانی گورننس' باقی سارے ادارے بچ گئے اور حالات معمول پر آنے کے بعد یہ آئینی دفعہ جو عارضی تھی، 1985 کے الیکشن کے بعد خود بخود ختم ہو گئی۔

جنرل حیات خان نے یہاں پر احتساب کا عمل بھی شروع کیا جس کے ذریعے تمام نمایاں سیاست دانوں کے خلاف مقدمات بنائے گئے۔ اس معاملہ میں کوئی اخلاص نہیں تھا۔ اصل میں پاکستان میں جنرل ضیاالحق کے خلاف جو تحریک چلی تھی اس میں آزاد کشمیر کے سیاست دان بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس لیے جس طرح پاکستان میں سیاست دانوں کے خلاف مقدمات بنائے گئے، اسی طرح آزاد کشمیر میں بھی بنائے گے تا کہ ان کو قابو میں لایا جائے۔ مقدمات سچے تھے اور نہ ہی ان کو نیک نیتی سے بنایا گیا تھا۔ برصغیر بالخصوص پاکستانی کلچر کے مطابق جانے والوں یا حکومت کا ساتھ نہ دینے والوں کو غدار اور وطن دشمن قرار دے کر fix up کرنا مقصود تھا۔ جو حکومت وقت کے ساتھ شامل ہو گئے، وہ مادرزاد پاک اور صاف ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ملکوں میں محب وطن اور شرفا کی فہرست ہر حکومت میں بدلتی رہتی ہے جس میں صرف حکومت دوست لوگ شامل ہوتے ہیں۔ باقی غدار۔

لوگو یہ نیا دور ہے نظروں کو سنبھالو
ظاہر کو نہ دیکھو کبھی باطن کو بھی دیکھو

آزاد کشمیر میں سیاسی ورکرز کو زچ کرنے کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہرحال عدالتوں نے انسانی اور شہری حقوق کا بھرپور تحفظ کیا اور ایسا کرنے والے صرف تین جج تھے جن میں جسٹس محمد

یوسف صراف، سردار محمد شریف اور عبدالمجید ملک تھے لیکن نام عدلیہ کا ہوا اور اس لحاظ سے پورے پاکستان میں آزاد کشمیر کی عدلیہ کو اچھی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ اس عرصہ کے بے شمار مقدمات پاکستان کے قومی جریدوں، پی ایل ڈی، پی ایل جے اور کریمنل لاء جرنل میں رپورٹ ہیں۔

سردار محمد ابراہیم خان صاحب نے بھی اپنی برطرفی کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی جس کے ساتھ نادر اور نایاب دستاویزات لگائیں جو فی الواقع سوائے ان کی رٹ کے کہیں اور نہیں مل سکتیں۔ یہ دستاویزات سیاسی اور آئینی ہونے کے علاوہ یو این سکیورٹی کونسل اور پاکستان کی حکومت کی کشمیر پالیسی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس رٹ کا فیصلہ بالآخر سپریم کورٹ میں اپیل میں ہوا اور اس نکتے پر ان کی برطرفی کالعدم قرار دی گئی کہ ان کی برطرفی کا حکم چیئرمین جموں و کشمیر کونسل نے جاری کیا تھا جس کو یہ اختیار نہیں تھا۔ کیا حکومت پاکستان کو آئین کی دفعہ 56 کے تحت یہ اختیار حاصل ہے؟ اور اگر حکومت پاکستان نے یہ حکم دیا ہوتا تو کیا وہ آئینی ہوتا؟ اس پر فیصلہ میں کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ P-986 PLD (SC)(AJK) میں رپورٹ ہوا ہے۔

سیاسی سرگرمیاں، چیئرمین زکوٰۃ کمیٹی

میں نے بھی وکالت کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ مجھے 1980 میں اپنے وارڈ میں زکوٰۃ کمیٹی کا ممبر منتخب ہونے کے بعد چیئرمین زکوٰۃ کمیٹی منتخب کیا گیا۔ اس طرح آزاد کشمیر میں میری سیاسی زندگی کی ابتدا ہوگئی۔ پاکستان میں جنرل محمد ضیا الحق کی حکومت کے اقدامات کی بازگشت آزاد کشمیر میں بھی سنائی دینے لگی بلکہ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا اس کی ہو بہو نقل یہاں ہونے لگی۔ کہنے کو تو آزاد کشمیر آزاد ہے لیکن یہ نہ تو کشمیر ہے اور نہ ہی آزاد ہے۔ نہ پاکستان کا صوبہ ہے اور نہ ہی کالونی۔ کشمیر اس معنی میں ضرور ہے کہ یہ ریاست کشمیر کا حصہ ہے اور آزاد اس لیے کہ یہاں کے لوگوں نے اپنی مرضی سے پاکستان کو پسند کر کے قبول کیا ہے، وگرنہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ اصل میں اسی کا پرتو ہے جو پاکستان کے باقی صوبوں میں ہوتا ہے۔ آزاد کشمیر کو کچھ اجارہ دار سیاست دان پاکستانی اتھارٹیز کو جل

دے کر پاکستان کا دفاعی یونٹ اور لوگوں کو پاکستان کے بے تنخواہ سپاہی ظاہر کرتے ہیں[107] جبکہ درپردہ ان کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ اسے محض جھانسے میں رکھ کر اپنے اختیار، اقتدار اور سیاست کو دوام دینا چاہتے ہیں اور، ریاست کے اندر ایک ریاست بنانا ہی ان کا مقصد حیات ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو جغرافیائی طور دیکھا جائے تو یہ روس، چین، افغانستان اور ہندوستان کی طرف سے پاکستان کے جملہ شمالی حصے اور جنوب میں گجرات تک ایک فصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کے لوگ فی الواقع ان حقوق کے بغیر جو پاکستان کے دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں، بے تنخواہ سپاہی ہیں لیکن سیاست دان نہ صرف تنخواہ بلکہ بھتہ بھی وصول کرتے ہیں اور اگر یہ بند ہو جائے تو ''وہ'' کرنے پر اتر آتے ہیں جو دشمن بھی نہیں کر سکتا۔ یہ کالونی یا مقبوضہ علاقہ اس لیے نہیں ہے کہ لوگ پاکستان کے خلاف نہیں ہیں اور افواجِ پاکستان کو قابض فوج نہیں سمجھتے۔ لیکن اس کا عبوری آئینی تعلق قائم کرنا ناگزیر ہے تاکہ یہ تاثر ختم ہو۔

میں زکوٰۃ کمیٹی کا ذکر کر رہا تھا۔ جنرل حیات خان بہت ہی محنتی، جفاکش اور دیانتدار شخص تھے جو کام کرنا چاہتے، اس کو کر کے دکھاتے تھے۔ اس کی تکمیل کے لیے جی جان سے کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے تمام زکوٰۃ کمیٹیوں کے سربراہان کا اجلاس بلوایا اور اس نظام کو کامیاب کرنے کے لیے سب کا تعاون چاہا۔ انہوں نے کہا، مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر اس نظام کے ذریعے لوگوں کے اندر خوشحالی آ جائے۔ میں نے اس نظریے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے وارڈ میں سوائے چند لوگوں کے جو بالکل معذور تھے، کے لیے سہ ماہی نقد وظیفہ مقرر کیا۔ بقیہ رقم جو اس زمانے میں دو یا اڑھائی لاکھ روپے ہوا کرتی تھی، خود کفالت کے لیے استعمال میں لائی۔ کچھ لوگوں کو بیس سے پچیس ہزار روپے کاروبار شروع کرنے کے لیے، کچھ کو اس کو فروغ دینے کے لیے اور کچھ لوگوں کو مشینیں خریدنے کے لیے دیئے۔ ان لوگوں میں سے میں اب بھی دیکھتا ہوں کہ اپر پلیٹ مظفرآباد میں تین لوگ ایسے ہیں جنہوں نے پولٹری کا کاروبار، درزی اور سبزی کا کاروبار شروع کر کے اپنے آپ کو اپنے قدموں پر کھڑا کر لیا ہے۔ اس وقت بھی ان کی دکانیں اسی جگہ بھری پڑی نظر آ رہی ہیں جہاں انہوں نے خود یا ان کے بزرگوں نے اس رقم سے شروع کی تھیں۔

اگر نیک نیتی اور خلوص سے کوئی کام شروع کیا جائے تو یقیناً اس کے مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں بلکہ نیک نیتی سے اگر آگ میں بھی چھلانگ لگائی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی گلزار بنا دیتا تھا۔ بدقسمتی سے یہ نظام اب سیاسی رشوت کے طور استعمال ہو رہا ہے اور ہر حکمران سیاسی جماعت اس کو اپنے ورکرز اور ووٹرز کے روزگار اور پرورش کے لیے استعمال کرتی ہے جس سے اس کے روح اور مقصد کو پامال کر دیا گیا ہے۔ اگر اس میں بھی انصاف کیا جائے پھر بھی مثبت نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حکمران سیاسی جماعت کے مستحق ورکرز اور ووٹرز کو اس کے دائرہ کار میں لایا جائے۔ اس کا بھی کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ حکومت جماعتوں کے اندر گشت کرتی رہتی ہے جس سے ہر جماعت کے مستحق شخص کو فائدہ مل سکتا ہے لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے اور اس کا استفادہ صرف با اثر اور صاحب حیثیت لوگوں کو ہی ملتا ہے۔

مجھے اس بندر بانٹ کی کسی اسلامی یا اخلاقی اصول کے تحت گنجائش نظر نہیں آتی ہے۔ زکوٰۃ کی مد سے رقم وزیروں، مشیروں اور اعلیٰ عہدے داروں کے علاج معالجہ اور سیاسی سرگرمیوں پر خرچ کی جاتی ہے۔ ان لوگوں کے لیے حکومت کے باقی خزانے بھی کھلے ہیں۔ غریبوں اور مستحقوں کا حق مار کر کیوں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مقرر کردہ اصولوں کی خلاف ورزی کی جاتی ہے اور وہ بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نظام کے نام پر؟

پاکستان میں ہر حکمران نے نئے نئے نام دے کر فنڈز مختص کیے جو بالآخر سیاسی رشوت کے طور استعمال ہو کر خرد برد ہوئے۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں کا مقصد نیک ہوتا لیکن عملاً ایسا ہو نہیں رہا مثلاً ضیاالحق نے عشر و زکوٰۃ، میاں نواز شریف صاحب نے بیت المال فنڈ، محترمہ بینظیر بھٹو صاحبہ نے سوشل ایکشن پروگرام، جنرل مشرف صاحب نے خود روزگار سکیم، آصف علی زرداری نے بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام اور پتا نہیں کیا کیا گنجائشیں پیدا کیں لیکن ان سب کا فائدہ اس کو نہیں مل رہا جس کے نام پر ایسا کیا جاتا ہے لیکن اس کا منفی اثر ہر شخص پر پڑتا ہے کیوں کہ یہ رقم بالآخر عام لوگوں سے مختلف ناموں کے ٹیکسوں کے ذریعہ وصول کی جاتی ہے۔ حکومت وقت اپنے اللوں تللوں پر خرچ کرتی ہے، سیاسی

ورکروں بلکہ عام لوگوں کو حرام خور، بیکار اور بھکاری بنا دیتی ہے۔

نظر آتے ہیں پجاری تو بہت دولت کے
کوئی الفت کا طلبگار نہیں دیکھا ہے

حیات خان کی لیڈر شپ

میں ذاتی طور پر جنرل محمد حیات خان صاحب کو ان کی محنت اور دیانت کی وجہ سے اس وقت بھی پسند کرتا تھا اور آج بھی میرے دل میں ان کے لیے انتہائی احترام ہے۔ لیکن یہ سب کچھ انہوں نے کسی لیڈر یا مدبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ مرکزی قیادت کے نمائندے اور مرکز کی غیر مشروط مدد اور تعاون سے کیا۔ ان کو گمان ہو گیا کہ غالباً وہ لیڈر ہو گئے ہیں اور لوگ ان کو اسی طور قبول کریں گے۔ حکومتی اتھارٹی کے ساتھ کام کرنا اور بات ہوتی ہے اور عوامی رہنما کی حیثیت سے کام کرنا بالکل ہی الگ فن ہے۔ پاکستان اور اس کے اندر آزاد کشمیر کی لیڈر شپ ایک فنکاری ہے، لیڈر شپ نہیں۔ جب ان کو آزاد کشمیر کی گدی سے الگ کیا گیا اور ادھر فوج سے بھی ریٹائرڈ ہو گئے تو ان کو اس بات کا احساس ہو گیا۔

مسلم کانفرنس میں شمولیت

جب آزاد کشمیر میں سیاسی سرگرمیاں بحال ہوئیں اور مختلف جماعتوں نے اپنا اپنا پنڈال لگانا شروع کیا تو میں نے بھی ان کا جائزہ لینا شروع کیا کہ مجھے اپنا کردار ایک سیاسی ورکر کی حیثیت سے کسی جماعت کے پلیٹ فارم سے ادا کرنا چاہیے۔ مقبوضہ کشمیر میں چوں کہ میں پہلے جماعت اسلامی کا حامی تھا، تاہم جب اس نے انتخابات کے ذریعہ قومی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو میں کانگریس میں شامل ہو گیا کیوں کہ انتخابی سیاست ہی کرنی ہے تو قومی سطح کی جماعت سے کرنی چاہیے نہ کہ مقامی جماعت سے۔ جماعت اسلامی کا مقبوضہ کشمیر اور پاکستان بھر میں یہ کردار رہا ہے کہ کسی بھی شروع ہونے والی عوامی تحریک کی پہلے مخالفت یا اس سے غیر جانبداری اور جب یہ مقبول ہونا شروع ہو جائے تو اس پر قبضہ کر لیتی

ہے جیسا کہ اس کی تحریک ہو۔ یہاں میرے خاندان کی اکثریت کا تعلق آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس سے تھا اور اس کی لیڈر شپ کے ساتھ ہمارے گھریلو اور خاندانی تعلقات تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں رہنے والا ہر مسلمان پاکستان کے نام سے جذباتی وابستگی رکھتا ہے، خواہ وہ کسی ہندوستانی قومی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو یا مقامی کشمیری پارٹی سے۔ مسلم کانفرنس کا موٹو ''کشمیر بنے گا پاکستان'' مجھے بہت پسند آیا اور یہ اپنے آپ کو مسلم لیگ کی نمائندہ جماعت کہتی تھی، اسی وابستگی کی وجہ سے میں نے مسلم کانفرنس میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔

غالباً 1982 کے وسط میں مرحوم محمد خان جونیجو اور پیر صاحب پگاڑا شریف، آزاد کشمیر تشریف لائے۔ انہوں نے مظفر آباد میں سردار محمد عبدالقیوم خان کے ساتھ اسمبلی ہاسٹل میں ایک جلسہ کیا جہاں سردار سکندر حیات خان صاحب بھی موجود تھے۔ وہ اس وقت غالباً مسلم کانفرنس کے صدر بھی تھے لیکن ہمہ گیر حیثیت سردار محمد عبدالقیوم خان کو ہی حاصل تھی۔ میں نے اس جلسہ میں مسلم کانفرنس میں شمولیت کا اعلان کیا۔ یہاں پر میرے اعلان کا پیر صاحب پگاڑا شریف اور سردار قیوم صاحب نے نوٹس لیا اور اپنی تقریر میں میری شمولیت کا خیر مقدم کرتے ہوئے ذکر کیا۔ میں نے وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے کشمیری کی حیثیت سے کہا کہ ''پاکستان کی تخلیق ایک معجزہ سے کم نہیں۔ اس پارٹی کا موٹو پاکستان ہے اور اس میں نسبتاً شریف لوگ ہیں۔ اس لیے میں نے اس میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا ہے جس کا میں اعلان کرتا ہوں''۔ سردار عبدالقیوم خان صاحب نے کہا کہ شریف لوگ صرف اسی جماعت میں نہیں بلکہ اور جماعتوں میں بھی ہیں۔ نامعلوم ان کا روئے سخن کس کی طرف اور مطلب کیا تھا لیکن کافی تجربہ اور دوسروں کے ساتھ اختلاط کے بعد میں بھی اس نتیجہ پر پہنچا کہ زیادہ شریف لوگ دوسری جماعتوں میں ہی ہیں۔

شریف وہ ہوتا ہے جو حلال کمائی بانٹ کر کھانے کا عادی ہو اور جو کہتا ہے اس کے کہنے کا مقصد بھی وہی ہوتا ہے۔ پیر صاحب پگاڑا شریف نے کہا کہ ''معجزے پیغمبروں پر ہوتے تھے، پاکستان معجزہ نہیں بلکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔'' معجزہ کا ہر وقت اور ہر جگہ وہی مطلب نہیں ہوتا جو اس کا پیغمبروں کے ساتھ منسوب کر کے لیا جاتا ہے۔ وقت اور حالات کے بدلنے سے لغت کے معنی بھی بدل جاتے ہیں، اس لیے میرا مقصد تھا کہ یہ ایک اعجاز تھا کہ تمام تر مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود ممکن بھی

ممکن ہو گیا۔ پیر صاحب کی باتوں کا تیر کہیں اور نشانہ کہیں اور ہوتا تھا۔ بہر حال مجھے آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی اور میں اس وقت بھی اسی بات کا قائل ہوں جو میں نے کہی تھی۔ مسلم کانفرنس میں شمولیت کے بعد میں اس کا ایک انتہائی سرگرم رکن اور معاون رہا گو کہ میں جماعت کا ممبر اور کسی بھی سطح کا عہدیدار نہیں رہا۔

1983 کے بلدیاتی انتخابات میں' میں نے اپنے وارڈ سے بلدیہ مظفر آباد کے رکن کی حیثیت سے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ گو کہ یہ غیر جماعتی انتخابات تھے لیکن مسلم کانفرنس نے اپنے ایک سرگرم اور صف اوّل کے لیڈر مرحوم عبدالعزیز کو میرے مقابلہ میں کھڑا کیا جس کو در پردہ مسلم کانفرنس کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ پیپلز پارٹی نے میری مخالفت نہیں کی۔ لبریشن لیگ نے اپنے ضلع کا صدر عبدالجبار میر میرے مقابلے میں کھڑا کیا۔ میں اس الیکشن میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گیا۔ ساری جماعتوں کی نظریں اس وقت اسی وارڈ پر لگیں تھی جہاں کانٹے دار مقابلہ تھا اس کے بعد ضلع اور میونسپلٹی کے چیئرمین کے انتخاب کی باری تھی۔

اس الیکشن کے تین دلچسپ واقعات آج بھی اس وقت کے لوگوں میں موضوع دلچسپی ہیں۔ ان میں سے ایک سید ارشد گیلانی کا پینا فلیکس پر میرے حق میں یہ شعر'' خار چن لو یا گلوں کا بانکپن۔ شہر والو فیصلے کا وقت ہے۔'' دوسرا میرے چھوٹے بیٹے راشد کا جس کی عمر اس وقت چار سال تھی، الیکشن کے دن اکیلا رہنے کی وجہ سے اس وقت چیخ اٹھا جب نتیجہ برآمد ہونے پر ہمارے گھر آنے والے ہجوم یہ نعرہ لگاتے تھے'' آوے ای آوے منظور گیلانی آوے ای آوے'' وہ چیختے ہوئے کہتا تھا'' نہ نہ امی آوے۔ امی آوے''۔ تیسرا ہارنے والے مضبوط امیدوار مرحوم عبدالجبار میر کو جب ہمارے حامیوں نے میرے ساتھ گاڑی پر ہار پہنا کے شہر میں چکر لگایا۔ یہ جمہوری رویہ کی انتہا تھی۔

میونسپل اور ضلع کونسل کی چیئرمین شپ

سردار عبدالقیوم خان نے مظفر آباد گیسٹ ہاؤس میں بلا کر مجھے مبارکباد دی اور کہا کہ میں

چیئرمین کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتا حالاں کہ انہوں نے میونسپلٹی کے چیئرمین کے لیے مسلم کانفرنس سے ملک محمد عرفان مرحوم جو اس وقت غالباً تحصیل یا بلدیہ مظفرآباد میں مسلم کانفرنس کے صدر تھے اور ضلع کونسل کے لیے راجہ عبدالقیوم خان جو اس وقت ضلع مظفرآباد مسلم کانفرنس کے صدر تھے، کو اپنے امیدواروں کے طور نامزد کر دیا تھا۔ میں نے سردار صاحب کو کہا کہ آپ چیئرمین بننے کے لیے میری حمایت کریں گے، جس پر انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، تم بھی کوشش کرو۔ اس کے بعد میں چیئرمین کے عہدے کے لیے سرگرم ہو گیا اور مجھے یہ گمان گزرا کہ سردار صاحب صحیح کہتے ہوں گے لیکن بالآخر میں ملک محمد عرفان کے مقابلہ میں ہار گیا۔ مجھے سردار صاحب کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔

مسلم کانفرنس نے آزاد کشمیر کی ساری ضلع کونسلوں میں اپنے لوگ ضلع چیئرمین بنوائے۔ یہ اس لیے ممکن ہوا کہ اس وقت سردار عبدالقیوم صاحب نے مرکز میں جنرل ضیاالحق مرحوم سے تعلقات استوار کر لیے تھے اور آزاد کشمیر میں ان کی مرضی کے صدر اور منتظم اعلیٰ جنرل ریٹائرڈ عبدالرحمن مقرر کیے گئے تھے جنہوں نے برملا سردار صاحب اور ان کی پارٹی کی حمایت کی تھی۔

سردار عبدالقیوم خان، الحاق پاکستان، الیکشن 1985 اور حکومت

سردار عبدالقیوم خان صاحب ہمیشہ مرکز کی مدد سے اقتدار میں آئے اور ان کو پاکستانی حکمرانوں کو رام کرنے کا گر بھی آتا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ پاکستان کی ملٹری اور سول بیوروکریسی کو الحاق پاکستان اور الحاق مخالف قوتوں کے ہیر پھیر میں پھنسا کر اپنی کرسی حاصل کی اور پاکستان کے حکمرانوں کے تعاون کا تاثر دے کر بلکہ ان کو گھیر گھار کے اس میں شامل کر کے کرسی حاصل کی ہے۔ حالاں کہ آزاد کشمیر میں پاکستان مخالف کوئی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی الحاق پاکستان کا مخالف ہے۔ ایک فرضی ہوا کھڑا کر کے پاکستان کی بیوروکریسی کو اپنی حمایت پر مجبور کیا جاتا ہے اور نہ معلوم وہ لوگ کس طرح اس جھانسے میں آ کر ایک فرضی رائے قائم کر لیتے ہیں کہ یہاں کچھ لوگ پاکستان کے مخالف ہیں۔ اگر کوئی اختلافی رائے رکھنے والے لوگ ہیں بھی تو وہ صرف کشمیر کے خودمختاری کے زیادہ سے زیادہ ایک یا دو

فیصد بلکہ اس سے بھی کم ہوں گے اور یہ بھی اسی طرف دھکیلے گئے ہیں۔ سردار عبدالقیوم صاحب ان کی بھرپور پشت پناہی بھی کرتے رہے اور ان کے پان دان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کو مالی طور زندہ رکھ کر سرگرمیوں میں مصروف کرواتے اور خود ان کی سرگرمیوں کو ایکسپلائیٹ کر کے مرکزی حکومتوں کے منظورِ نظر بنتے رہے۔ جناب کے ایچ خورشید مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ آزاد کشمیر میں سب سے بڑا خودمختار یہ سردار قیوم ہے۔ کشمیر بنے گا پاکستان کا مبہم نعرہ، آزاد کشمیر کے پاکستان سے آئینی تعلقات قائم نہ ہونے دینا، پاکستانی قومی جماعتوں کو غیر ریاستی جماعتیں کہنے کے باوجود ان کا اتحادی بننا، ریاستی تشخص کی مبہم اصطلاح اور در پردہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ گٹھ جوڑ اس کے واضح دلائل ہیں۔

1985 کے اسمبلی کے الیکشن میں مرکزی حمایت کا تاثر اجاگر کر کے ایسا ماحول پیدا کیا گیا جیسے کہ یہی ریفرنڈم یا اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے تحت کشمیر کے مسئلہ کے حل کے لیے رائے شماری ہے۔ میں بھی اس ساری مہم کا حصہ تھا اور میں اس بات کو یقینی طور صحیح سمجھ کر مظفرآباد اور اس وقت کے متحدہ ضلع پونچھ کے الیکشن کمپین میں سردار صاحب کے ہمراہ رہا۔ انہوں نے صرف اسی ایک پوائنٹ پر اپنے آپ کو پاکستان کا واحد حامی اور باقی سیاسی پارٹیوں کو پاکستان مخالف صف میں کھڑا کر دیا۔ جب پاکستان کے ساتھ وابستگی کی بات آتی ہے تو کشمیر کے دونوں حصوں کے لوگ جذباتی ہو جاتے ہیں جس کا سردار صاحب بھرپور فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ باقی پارٹیوں کو پاکستان مخالف فاشسٹ اور نہ جانے کیا کیا گردانا اور حیات خان صاحب کو بد دیانت، خائن اور نہ جانے کن کن القابات سے نوازا گیا۔ مرحوم کی دیانتداری شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ خودمختار کشمیر کے حامیوں کے خلاف سردار صاحب کا یہ جملہ اس زمانے میں بہت باعث نزع بنا رہا کہ ''یہ جھاڑیوں کی پیداوار ہیں۔''

جنرل عبدالرحمان ایک سادہ لوح فوجی تھے۔ ان کو یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ ان کو آزاد کشمیر کا صدر بنایا جائے گا۔ انہوں نے بھی ان کی حمایت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی لیکن وقت آنے پر ایسا نہیں ہوا۔ اس وقت تو میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی لیکن جب یہ راز کھلا کہ سردار قیوم صاحب اور سردار سکندر حیات صاحب بظاہر تو ایک ہیں لیکن اصل میں اندر سے ایک دوسرے کی

دھکم پیل میں تھے۔ شاید سردار صاحب نے جنرل صاحب کو دیانت داری سے اس مفروضے پر یہ باور کروایا تھا کہ وہ خود وزیر اعظم ہوں گے اور جنرل صاحب کو صدر بنایا جائے گا۔ لیکن جب سردار سکندر حیات صاحب وزیر اعظم بن گئے تو سردار قیوم صاحب کے لیے صدارت کے علاوہ اور کوئی منصب ممکن نہ رہا۔ جس دن جنرل صاحب کو الوداعی دعوت دی گئی، انہوں نے بھی اس روز کچھ ادھار نہ چھوڑا اور بھری محفل میں دونوں سرداروں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔ سردار سکندر صاحب یہ تاثر دیتے رہے کہ ضیاالحق، سردار صاحب کو پسند نہیں کرتے اور صدر بھی نہیں بنانا چاہتے تھے، میں نے ایسا کروایا۔ لیکن حقیقت میں سکندر صاحب بھی سردار صاحب کی وجہ سے بنے۔

میاں غلام رسول بنام گل خنداں

مسلم کانفرنس 1985 کے الیکشن میں سب سے بڑی پارلیمانی پارٹی کے طور پر سامنے آئی لیکن اس کو حکومت بنانے کے لیے مطلوبہ اکثریت حاصل نہ تھی۔ الیکشن کے غیر سرکاری نتائج کے دوران سردار قیوم صاحب کو یہ اطلاع دی گئی کہ حلقہ نیلم سے میاں غلام رسول مرحوم کو گل خنداں کے مقابلے میں جعلی ووٹوں سے کامیاب قرار دیا گیا ہے اور ہنوز سرکاری گنتی ہونا باقی تھی۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں فوری طور نیلم جا کر سرکاری گنتی میں شامل ہو جاؤں اور ہر پولنگ سٹیشن کی گنتی کرواؤں۔ چنانچہ میں راجہ محمد حنیف خان ایڈوکیٹ اور حاجی اشرف ایڈوکیٹ کو ساتھ لے کر آٹھمقام روانہ ہو گئے۔ ان دنوں نوسیری کے مقام پر پل ٹوٹ گیا تھا اس لیے ہم لوگ موت کی کشتی یعنی رسوں پر چلنے والی ایک ڈولی میں چڑھ کر دریائے نیلم کے اس پار گئے۔ یہ جان لیوا سفر تھا اور میری زندگی کا دوسرا خطرناک ترین سفر۔

ہم نے ریٹرننگ آفیسر، سردار نعیم شیراز اسسٹنٹ کمشنر کو سارے پولنگ سٹیشنوں کی گنتی کی خاطر درخواست دی لیکن اس نے لیت و لعل کیا جس پر میری اس کے ساتھ تلخی بھی ہو گئی۔ ہمارے امیدوار سردار گل خندان نے مجھے علیحدہ لے جا کر کہا کہ اے سی صاحب جو ریٹرننگ آفیسر تھے، کے ساتھ تلخی نہ کریں، یہ ناراض ہو جائیں گے۔ جس پر میں نے اس کو جھاڑ پلائی کہ وہ اس سے زیادہ تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے

94

107

کہ تمہیں ہرا کر اس نے تمہارے مخالف کو کامیاب قرار دے دیا ہے۔ دُور دراز اور بالخصوص سرحدی علاقے کے رہنے والے لوگوں کے لیے وہاں کے انتظامی، سول اور فوجی آفیسر بالخصوص ایجنسیوں کے لوگ جو صوبیدار یا زیادہ سے زیادہ کیپٹن رینک کے ہوتے ہیں، بادشاہ اور وہاں کے سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں۔ غالباً موصوف نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں ہار تو گیا ہی ہوں، کم از کم مقامی آفیسر کے ساتھ تو نہ بگاڑوں۔

ہم لوگ رات بھر گنتی کرتے رہے اور ناجائز طور پر مسترد یا قبول کیے گئے ووٹوں کو صحیح قانونی صورتِ حال کے تناظر میں دیکھا۔ ہمارے بالمقابل شیخ عبدالعزیز مرحوم ایڈووکیٹ تھے جو مرحوم میاں غلام رسول کی جانب سے گنتی کر رہے تھے، ہم نے پایا کہ حاجی صاحب کے اکثر ووٹ ناجائز طور پر مسترد کیے گئے تھے بلکہ ایک پولنگ سٹیشن پر جعلی ووٹر لسٹ کے ذریعہ ووٹ بھی پول کرائے گئے تھے۔ جب وہاں کے لوگوں کی ہم نے ووٹر لسٹ نکلوائی تو وہ بلا دستخطی مرتب شدہ تھی اور یہ تمام کام ریٹرننگ آفیسر کے ناظر کی ملی بھگت سے ہوا تھا۔ اس ناظر نے دو اوراق پر مشتمل اس ووٹر لسٹ کو چبا کر نگل لیا جس میں غالباً 72 ووٹ تھے جبکہ میاں غلام رسول مرحوم کو گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے غیر سرکاری طور کامیاب قرار دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ حاجی گل خنداں کے ناجائز طور پر مسترد کیے گئے ووٹوں کو گنتی میں شمار کروا کر حاجی صاحب غالباً 60 ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب قرار دیئے گئے۔

ادھر وادی کے مہاجرین کے پشاور کے حلقہ سے عبداللطیف سلہریا کے ساتھ ہمارے رابطے تھے، اس وقت کے کشمیر افیئرز کے منسٹر جناب قاسم علی شاہ سے میرا خصوصی تعلق تھا جن کی مدد سے سلہریا صاحب کو مسلم کانفرنس میں شامل کرایا۔ اس میں مرکزی حکومت کے دیگر ذمہ داران کا بھی عمل دخل تھا لیکن بنیادی کاوش میری تھی۔ اس طرح میری ذاتی کاوشوں سے دو نشستوں کے آنے سے مسلم کانفرنس کو واضح برتری حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد اکثر آزاد امیدوار ہمارے ساتھ شامل ہو گئے اور مسلم کانفرنس حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ میاں صاحب ذاتی طور پر بہت نفیس آدمی تھے لیکن اس واقعہ کے بعد میرے ذاتی مخالف ہو گئے اور زندگی بھر جہاں اور جس جگہ پر بھی موقع ملتا رہا، میری مخالفت کرتے رہے۔ 1985 کی مسلم کانفرنس کی حکومت بنانے میں میرا کلیدی کردار تھا، اس لیے اکثر مخالف جماعتوں نے مجھے بالخصوص

تنقید اور تعزیر کی زد میں رکھا۔لیکن اس سے میں ایک نمایاں مقام حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

وزارتِ عظمیٰ کی کشمکش

ادھر مجھے اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ مسلم کانفرنس میں سردار عبدالقیوم خان اور سردار سکندر حیات خان اندر ہی اندر سے ایک دوسرے کے مخالف اور وزیر اعظم بننے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور انہوں نے اندرون خانہ اپنی اپنی لابیاں سرگرم کر رکھی تھیں۔میرا خیال تھا کہ سردار قیوم صاحب سب کچھ نیک نیتی سے کر رہے ہیں اور محض جماعتی مفاد میں سارا کچھ کہہ اور کر رہے ہیں۔ایک مرتبہ انہوں نے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے الطاف کیانی، سیاب خالد، ملک عبدالرشید اور بشیر قریشی کی اس بارے میں رائے پوچھی کہ ایسے حالات میں وزیر اعظم کس کو بننا چاہیے؟ تو سب نے سردار صاحب کو کہا کہ آپ کا وزیر اعظم بننا ازبس ضروری ہے کیوں کہ اتنے طویل عرصہ اور سیاسی گھٹن کے بعد مسلم کانفرنس حکومت بنانے کی پوزیشن آئی ہے، لہٰذا آپ کا وزیر اعظم بننا ضروری ہے۔جبکہ میں نے کہا کہ آپ پدرانہ کردار ادا کرتے ہوئے سردار سکندر حیات کو وزیر اعظم بنائیں جس سے ورکرز کی حوصلہ افزائی ہوگی اور جماعت پر لوگوں کا اعتماد بڑھے گا کہ سپریم لیڈر نے اپنی زندگی اور اچھی پوزیشن ہونے کے باوجود اپنے جونیئر کولیگ کو وزیر اعظم بنایا-اس پر سکتہ طاری ہو گیا سردار صاحب نے اثبات میں سر تو ہلا دیا لیکن دل میں یہ بات رکھ لی۔

انہوں نے ایک روز میرے چھوٹے بھائی نذیر الحسن گیلانی کے ہاتھ، جو ان کے بہت قریب تھا، پیغام بھجوایا کہ منظور کو کہیں کہ ہمارے ماحول کے مطابق رویہ اختیار کرے، یہاں ہندوستانی طرز کی جمہوریت یا آزاد فکری نہیں ہے۔میں تو اس زمانے میں سکندر حیات خان کو اچھے طریقے سے جانتا بھی نہیں تھا۔میرا اگر کوئی تعلق تھا بھی تو وہ سردار قیوم صاحب کے ساتھ تھا۔میری سوچ دیانتداری پر مبنی تھی اور ایک اچھے سیاسی کارکن کی طرح جو بات بہتر سمجھتا تھا کرتا تھا۔مجھے ان لوگوں کی اندرون خانہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا علم نہیں تھا۔اسی طرح ایک بار اسی بھائی نے سردار عتیق خان کا مجھے

پیغام پہنچایا کہ جب مجاہد اوّل کوئی بات کریں تو اس کے حق میں دلیل دیا کریں۔اس بات کی تردید یا ترمیم کی کوشش نہ کریں۔مجھے ان لوگوں کے طرزِ عمل کی سمجھ نہ آئی کہ یہ کیسے لوگ ہیں؟

میں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کی امریکن سفیر سے گفتگو کا ایک واقعہ پڑھا تھا جو ہندوستانی پارلیمنٹ میں وزیر اعظم آفس کے چیمبر میں پنڈت نہرو کے پاس بیٹھا تھا۔ادھر پارلیمنٹ میں حزبِ اختلاف کے بنگال سے کوئی صاحب پنڈت نہرو پر ذاتی اور جماعتی حملے کر رہے تھے۔امریکن سفیر نے پنڈت جی کو کہا کہ ''اگر آپ ہاؤس کے اندر ہوتے تو ایسا ممکن نہیں تھا''، جس پر انہوں نے جواب دیا کہ ''ایسا ہی ہونا چاہیے، اور مجھے خوشی ہے کہ میرے ملک کے پارلیمنٹیرینز کی ٹریننگ ہو رہی ہے جس سے حکومت کو اپنے حدود کے اندر رہنے میں رہنمائی حاصل ہوگی۔یہ میری نہیں بلکہ میرے ملک اور قوم کی بات ہے۔'' میں تو اپنے ملک کو اور اس کے لیڈرز کو اسی انداز سے دیکھ رہا تھا لیکن یہ لوگ اپنی پارٹی یا ملک کے حوالے سے نہیں، بلکہ اپنی ذات کے حوالے سے معاملات کو دیکھ رہے تھے۔

حکومت سازی کے لیے سردار قیوم صاحب نے پہلے جنرل حیات خان صاحب اور اس کی پارٹی کے 9 ممبران کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔جس سلسلے میں سردار سیاب خالد نے اس وقت کے ممبران اسمبلی جو جنرل صاحب کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔سردار روشن خان، کرنل نقی خان اور دو دیگر لوگوں کو کاکا جی ہاؤس پنڈی بلایا جو سردار قیوم صاحب کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔غالباً اس وقت ان لوگوں کے ساتھ ان کی بات نہیں بن سکی۔میں یہ سارا کچھ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ الیکشن کے دوران ان متحارب لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف ناقابل بیان، ناجائز اور نازیبا الزامات لگائے تھے، لیکن مفاد کی خاطر اکٹھے ہونے لگے۔مجھے ان لوگوں کی ان باتوں سے گھن آنے لگی۔ادھر سردار قیوم صاحب کی درویشی اور ادھر ایسی حرکت پر ندامت ہو رہی تھی۔گو کہ سیاست میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی اور کل کا دشمن آج کا دوست ہو سکتا ہے لیکن جو اللہ، اس کے رسول، اخلاق اور اعلیٰ قدروں کے دعوے دار ہوں، ان سے ان باتوں کی قطعاً توقع نہیں کی جاسکتی کیوں کہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات اور یہ باتیں اکٹھی نہیں چل سکتیں۔

سکندر حیات وزیر اعظم

سکندر حیات خان لابنگ کرنے اور ٹیبل ٹاک میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اس بات کا احساس مجھے ان کے ساتھ طویل عرصہ گزارنے کے بعد ہوا۔ انہوں نے اپنی لابنگ سرگرم رکھی تھی چنانچہ مرکزی حکومت نے ان کو ہی وزیر اعظم بنایا جنہوں نے 16 جون 1985 کو عہدہ سنبھالا۔ جبکہ سردار قیوم صاحب کو صدر بنانے پر بقول سکندر صاحب مرکز کے تحفظات تھے۔ سردار قیوم صاحب گو کہ جنرل ضیاالحق مرحوم کے بہت قریب ہو گئے تھے لیکن سردار سکندر حیات کے بقول جنرل صاحب ان کو صدر بنانے پر بھی آمادہ نہیں تھے جن کو ''میری'' یعنی سردار سکندر حیات خان صاحب کی یقین دہانی پر صدر بنایا گیا۔ مجھے یقین نہیں کہ یہ بات درست ہے۔ سردار عبدالقیوم صاحب کو 30 ستمبر 1985 کو صدر منتخب کیا گیا۔

تمام جماعتی کارکن سردار سکندر حیات خان صاحب کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتے تھے اور ان کا تاثر یہ تھا کہ سکندر حیات صاحب محض کٹھ پتلی ہیں اصل تو سردار قیوم صاحب ہی ہیں لیکن سکندر صاحب کی کارکردگی نے اس تاثر کو غلط ثابت کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو قطع نظر دیگر خامیوں کے اس منصب کا اہل ثابت کیا۔ سکندر صاحب نے ابتدائی دنوں میں ہی سردار عبدالقیوم صاحب کے ایک معتمد خاص، راجہ نیاز خان مرحوم سیکریٹری سروسز کو ملازمت سے برطرف کر کے انتظامیہ اور سردار قیوم صاحب کو سخت پیغام پہنچایا۔ اس وقت اسمبلی میں بہت مضبوط اور قدآور لوگ تھے۔ اس لحاظ سے ایک مضبوط اپوزیشن اور مضبوط اسمبلی تھی۔ جناب خورشید حسن خورشید مرحوم، جناب حیات خان اور جناب بیرسٹر سلطان محمود نے اس اسمبلی کے قد کاٹھ کو بہت اونچا کیا تھا۔ سردار سکندر حیات جماعت میں اپنی پوزیشن اور اسمبلی میں ان لوگوں کی موجودگی میں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے الیکشن کے دوران ان کی اعانت سے متناسب نمائندگی والی ترمیم کرائی جس کے تحت جو سیاسی پارٹی پورے آزاد کشمیر اور متعلقہ حلقہ میں ووٹوں کی ایک خاص حد حاصل نہیں کر سکے گا اس کی رجسٹریشن منسوخ اور اس کی ٹکٹ پر منتخب ہونے والے لوگوں کی نشستیں خالی ہو جائیں گی۔ جنرل محمد حیات خان کی

107

پارٹی تحریک عمل اور غالباً لبریشن لیگ اس قانون کی زد میں آ رہی تھیں جو اس قانون کی رو سے ووٹوں کی مطلوبہ معیار پر پورے نہیں اتر سکی تھیں۔ انہوں نے اس قانون کی آئینی حیثیت کو عدالت عالیہ میں چیلنج کر دیا جس کے نتیجے میں اس قانون کو آئین سے متصادم قرار دیتے ہوئے کالعدم قرار دیا گیا اور ان پارٹیوں کی رجسٹریشن اور حاصل کی گئی نشستیں بچ گئیں۔ یہ جسٹس عبدالمجید ملک صاحب کے بہترین فیصلوں میں سے ایک فیصلہ ہے جو تحریک عمل پارٹی کے کیس کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقدمہ کی وجہ سے آزاد کشمیر میں ایک سیاسی ارتعاش پیدا ہو گیا۔ سردار سکندر کی حکومت جسٹس ملک عبدالمجید کے درپے ہو گئی۔

الیکشن کے بعد ایک انتہائی غلط سیاسی اور آئینی ترمیم لائی جو ساتویں ترمیم کے نام سے آئین کی دفعہ 18-B میں ایک شق کا اضافہ کرایا کہ جن ممبران اسمبلی نے وزیر اعظم کے انتخاب کے وقت ان کے حق میں ووٹ دیا ہے، تحریک عدم اعتماد میں ان کا ووٹ شمار نہیں ہوگا۔ اس ترمیم کے ذریعہ اسمبلی کے ممبران کی تعداد میں بھی اضافہ کیا گیا جس کے تحت پانچ خواتین ممبرز، ایک ممبر عالم دین، ایک سمندر پار ممبر لوگوں کا نمائندہ اور ایک ٹیکنوکریٹ کو ممبر اسمبلی منتخب کرنے کے لیے بالواسطہ الیکشن کی گنجائش پیدا کی گئی۔ وزیر اعظم کی حد تک ترمیم سیاسی طور غلط اور آئین کی روح کے منافی تھی کیوں کہ اس طرح وزیر اعظم ایک آئینی آمر کے طور پر سامنے آیا۔ اس کے خلاف آزاد کشمیر بھر میں اور پھر پاکستان کے کچھ حلقوں میں شدید ردِعمل ہوا۔ بالآخر اس ترمیم کو ختم کروانا پڑا۔ اس کے بعد 1987 میں بلدیاتی انتخابات میں دھاندلی کے الزام کی وجہ سے آزاد کشمیر میں ایک تحریک نے جنم لیا جس کے روحِ رواں خورشید حسن خورشید مرحوم، سردار محمد ابراہیم خان صاحب اور بیرسٹر سلطان محمود تھے۔

اس تحریک نے سردار سکندر حیات کی حکومت کو بے بس کر دیا۔ ادھر وزارتِ امورِ کشمیر کے وزیر سید قاسم علی شاہ نے جنہوں نے سردار سکندر حیات کی حکومت بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، بھی سکندر صاحب کو فکس اپ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ میرے خیال میں سکندر حیات صاحب کے Assertive ہونے کی وجہ سے وہ لوگ نالاں تھے۔ آخر کار قاسم علی شاہ صاحب کی مداخلت سے ان

لوگوں کا آپس میں راضی نامہ ہوا۔لیکن وزیراعظم کے عدم اعتماد کی حد تک آئینی ترمیم واپس لینے کے علاوہ دیگر اقدامات بھی کیے گئے جس کی وجہ سے تحریک ختم ہوگئی۔سردار قیوم صاحب نے سپریم کورٹ کی بلڈنگ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ'' فٹے منہ ہو ہم پر جنہوں نے اپنے نفاق کی وجہ سے ایک ان پڑھ وفاقی وزیر کے کہنے پر انگوٹھا ٹیکا۔''اس تحریک کے پس پردہ سردار قیوم صاحب کا ہاتھ ہونا بھی بتایا جاتا تھا کیوں کہ اس کو Defuse کرنے کے لیے انہوں نے کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا جس کا سبب ان کا بیٹا سردار عتیق احمد خان بتایا جاتا ہے جس کی کراؤن پرنس کی طرح پرورش کی جارہی تھی۔

سردار سکندر کی اس وجہ سے بہت سبکی ہوئی اور ان کے مخالفین کو ان پر ایک طرح کی اخلاقی سبقت حاصل ہوگئی۔اسمبلی کی نشستوں میں بالواسطہ اضافہ کی وجہ سے سردار سکندر حیات کی حکومت کو عدم اعتماد سے بالواسطہ راحت ملی،البتہ اس اضافے سے آزاد کشمیر کی الیکشن کی سیاست میں کرپشن کے ایک ایسے باب کا اضافہ ہوا جو ہماری سیاست اور آئینی زندگی پر ایک بدنما داغ ہے۔سمندر پار والی سیٹ لاکھوں کی بولی سے شروع ہو کر کروڑوں پر ختم ہوتی ہے۔اس کی ضرورت ہی نہیں،اگر ہو بھی تو کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر سمندر پار پاکستانیوں کی نشستوں میں اضافہ کر کے ان کا براہ راست الیکشن کرایا جاتا جس سے ایک تو صحیح نمائندگی میسر آتی اور دوسرا کشمیریوں کی تحریک صحیح طور پر متحرک بھی ہو جاتی جو نمائندگی کی اصل روح ہے۔

جس عرصہ کے دوران، میں'' آزاد کشمیر کا چیف الیکشن کمشنر تھا، یہ بات اس وقت کے امورِ کشمیر کے وزیر فیصل صالح حیات سے ہوئی تھی جنہوں نے اس بات کو بہت سراہا۔لیکن لوکل لیڈروں نے اس کی مخالفت کی کیوں کہ ان کی تجوریاں متاثر ہوتی تھیں۔1991 کے الیکشن کے بعد چوہدری محمد خان جو سمندر پار کشمیریوں کی جانب سے ممبر اسمبلی بھی رہے، میرے پاس آکر روئے کہ سردار عبدالقیوم صاحب اور ان کے بھائی عبدالغفار خان مرحوم نے مجھ سے اسمبلی سیٹ کے لیے پینتالیس لاکھ روپے لیے لیکن میری جگہ راجہ منشی خان کو ممبر بنوایا، اس لیے ان کے خلاف کیس کرنا ہے۔میں نے ان سے کہا

کہ لوٹ کھسوٹ واپس نہیں ہوتی، اگلے الیکشن کا وعدہ لے لو۔اس وقت اس نے یہی کیا کیوں کہ اگلے الیکشن میں وہ ممبر بن گیا۔ان خصوصی نشستوں کی وجہ سے اسمبلی کا نمائندہ ہونے کا کردار بھی مشکوک ہو گیا۔اب آزاد کشمیر کی اسمبلی کے 49 ممبران میں سے 20 آزاد کشمیر کے عوام کے نمائندہ نہیں بلکہ غیر مقیم اور لیڈروں کی نمائندگی/ پشت پناہی کرنے والوں کے یا ان کے منظورِ نظر ہیں۔آزاد کشمیر اسمبلی اور حکومت ایک معمہ ہے جس کا ثانی آئینی تاریخ میں نہیں مل سکتا اور یہ سب کچھ تحریک آزادیٔ کشمیر کے فرضی نعرے پر کیا جارہا ہے۔

بطور ایڈووکیٹ جنرل

1985 کے الیکشن کے تمام قانونی پہلوؤں کا میں انچارج تھا، چنانچہ جتنے بھی الیکشن کے تنازعات پیدا ہوئے، ان میں پہلے تو میں مسلم کانفرنس اس کے امیدواروں اور پھر حکومت کی جانب سے تمام مقدمات کی پیروی کرتا رہا۔سردار سکندر حیات کی حکومت نے مجھے مارچ 1986 میں آزاد کشمیر کا ایڈووکیٹ جنرل مقرر کیا جو اصل میں اس وقت کے سیکریٹری قانون خلیل احمد قریشی کی تجویز پر ہوا۔قریشی صاحب نے میری وکالت کے دوران بھی حکومت کے اہم مقدمات میرے سپرد کروائے تھے۔جس وقت میرے ایڈووکیٹ جنرل بننے کی بات چل رہی تھی، اس وقت میرے خلاف پیشہ ورانہ رقابت کی وجہ سے ایک لابی نے سردار عبدالقیوم جو اس وقت صدر ریاست تھے، سے مل کر میری مخالفت میں انتہائی قبیح الزام لگایا کہ میں ہندوستانی جاسوس ہوں۔اس کے پس پردہ چند سرکردہ وکیل تھے اس سارا واقعہ کو بعد ازاں راجہ حنیف صاحب نے مجھے خود بتایا۔راجہ حنیف اس وفد میں شامل تھے جو سردار عبدالقیوم خان صاحب سے ملا تھا۔

آزاد کشمیر میں ایک خاص طبقہ کے لوگوں کا میں نے ایک عجیب مزاج دیکھا کہ جب کسی کو آگے بڑھتا دیکھتے ہیں یا کسی کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے تو اس کے خلاف ہندوستانی جاسوس یا مرزائی ہونے کا الزام لگا دیتے ہیں۔میرے علاوہ یہ الزام محمد یوسف صراف مرحوم اور دیگر کئی کشمیری مہاجرین پر لگایا گیا۔جن میں سے کچھ کو تو push back کیا گیا اور کچھ پاکستان کے دیگر

صوبوں میں آباد ہو گئے۔ جناب جسٹس بشارت احمد شیخ صاحب کے خلاف تو مرزائی ہونے کا تحریری الزام لگا کر ان کے چیف احتساب کمشنر کے عہدے کو چیلنج بھی کیا گیا تھا۔ اس کے پس پشت بھی کچھ سیاست دان تھے جن کے خلاف بشارت شیخ نے توہین عدالت کا مقدمہ چلوایا تھا۔ جب کسی شخص کے جنیوئن کام سے انکار ممکن نہ ہو وہاں حریف قوتیں یکجا ہو کر اس کی کردار کشی، تحقیر تمسخر اڑاتے اور بے توقیر کرتے ہیں لیکن اگر اس کی مدافعانہ قوتیں متحد ہو جائیں تو اس کو اپنا لیتے ہیں۔

میرے ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہونے کے وقت سردار رفیق محمود خان ایڈووکیٹ جنرل ہوا کرتے تھے جو سردار محمد ابراہیم خان مرحوم کے عزیزوں میں سے تھے اور کافی عرصہ سے آزاد کشمیر کے ایڈووکیٹ جنرل چلے آ رہے تھے۔ سردار ابراہیم صاحب نے سردار قیوم صاحب سے ان کو برطرف نہ کرنے کی سفارش کی (جو ان کی بات کو کبھی ٹالتے نہیں تھے)۔ اگر ان کی بات ہوتی تو وہ یقیناً رفیق محمود صاحب کو ان کی جگہ پر برقرار رکھتے لیکن یہ حکومت کی سفارش پر ہو رہا تھا۔ چنانچہ سردار صاحب نے ان کو سردار سکندر حیات کو کہنے کو کہا جس پر سردار سکندر حیات سے بات کی گئی تو انہوں نے برجستہ اور صاف جواب دیا کہ میری حکومت عدالتوں میں ایک فریق ہوتی ہے اور یہ فریق کا حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کا وکیل مقرر کرے۔ اگر میں اپنی مرضی کا وکیل بھی مقرر نہ کر سکوں تو میں اپنی حکومت کا دفاع کیا کروں گا؟ اس طرح انہوں نے سردار رفیق محمود صاحب کی جگہ میری تقرری عمل میں لائی۔ سکندر حیات صاحب نے اپنے کابینہ سیکریٹری کو کہہ رکھا تھا کہ ایڈووکیٹ جنرل کو قانون سے متعلقہ معاملات کی صورت میں کابینہ کے اجلاس میں ہمیشہ بلایا کریں اور ایسا ہی ہوتا رہا۔ رفیق محمود صاحب کے دل میں میرے خیال میں یہ رنجش اب تک برقرار ہے۔

سردار قیوم صاحب اور سکندر حیات صاحب کے اندرونِ خانہ جنگ میں میں کسی کا طرف دار نہیں تھا کیوں کہ میں اپنے آپ کو جماعت کے حوالے سے حکومت کا وکیل سمجھ کر کام کرتا تھا اور یہ میری دیانت دارانہ رائے تھی کہ میں محض پارٹی اور پارٹی کی حکومت کی وجہ سے اس عہدے پر تھا، وگرنہ آزاد کشمیر میں محض دس برس قیام کے اندر میں کیسے آزاد کشمیر کے صف اوّل کے عہدے پر فائز ہوتا۔ تاہم

میں سردار قیوم صاحب کو ہر لحاظ سے محترم اور قابل تقلید اور تقدیم سمجھتا تھا بلکہ ذاتی طور ان کو سردار سکندر سے زیادہ مقام دیتا تھا، وہ یقیناً اس قابل بھی تھے اور یہی سردار سکندر حیات صاحب کا بھی خیال تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ حکومت کی ایما پر ہوتا۔ بااین ہمہ سردار سکندر حیات کو میرے بارے میں باور کرایا گیا تھا کہ میں سردار قیوم صاحب کا طرف دار ہوں اور اس کی وجہ میرے بھائیوں (نذیر گیلانی اور ظہور گیلانی) کے سردار صاحب اور ان کے بیٹے سردار عتیق احمد خان (جو بعد ازاں وزیر اعظم آزاد کشمیر بھی رہے) کے ساتھ ذاتی تعلقات تھے۔

ہر شخص کے دوسرے کے ساتھ تعلقات کی اپنی نوعیت ہوتی ہے۔ اگر میرے کسی عزیز یا دوست کے میرے کسی دشمن کے ساتھ کسی معاملے میں تعلقات ہیں تو مجھے اس سے پریشان نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ میں اپنے اعمال و اقدامات کا ذمہ دار اور مجاز ہوں دوسرے کا نہیں۔ ہاں اگر یہ تعلقات میرے خلاف ہوں اور اس کا اظہار بھی ہو جائے تو یقیناً قابل گرفت اور باعث تشویش ہے جبکہ میرے حوالے سے ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے تو سردار سکندر حیات نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کہی، البتہ وہ حسب معمول اور حسب توفیق ہر آدمی کے خلاف کنٹری لگاتے رہتے تھے اور ہر ملنے والے کی ہاں میں ہاں ملانے کے عادی تھے، اس کے چلے جانے کے بعد اس پر مضحکہ خیز فقرے کستے تھے۔ میرے خیال میں میرے خلاف شاکیوں کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے، اس لیے لوگوں نے یہ باور کر لیا تھا اور اس کا بظاہر جواز سردار قیوم صاحب کی فیملی کے ساتھ میرے بھائیوں کے ذاتی تعلقات ہی تھے۔

سکندر حیات کی حکومت کے دوران اس وقت کے سیکریٹری قانون راجہ بشیر احمد خان، اکثر سکندر حیات سے میری شکایات لگایا کرتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ یہ شکایت ہوا کرتی تھی کہ میں سرکاری مقدمات میں عدالت میں Concede کر لیتا ہوں۔ یہ کسی حد تک درست بات تھی کیوں کہ جو بات یا عمل قانون کے خلاف ہو، اس کا مقابلہ کرنا بے وقوفی اور پیشہ ورانہ بددیانتی ہے۔ میں وکیل ہونے کی وجہ سے ہی ایڈووکیٹ جنرل تھا، اس لیے میں اپنے پیشہ ورانہ طرزِ عمل کو سرکاری

عہدے کے لیے داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ جہاں انتظامیہ صریحاً غلط ہوتی تھی، وہاں میں یا تو عدالت میں مہلت لے کر معاملہ ٹھیک کروا لیتا تھا اور اگر انتظامیہ ایسا نہ کرتی تو میں عدالت میں Concede کر دیا کرتا تھا۔ ایسا ہی ایک کیس میرے خلاف خوب بڑھا چڑھا کر وزیر اعظم کو پیش کیا گیا۔ سردار ابراہیم خان صاحب نے اپنی صدارت سے برطرفی کو عدالت میں چیلنج کیا تھا جو اپیل کی صورت میں سپریم کورٹ کے پاس تھا۔ میں نے سپریم کورٹ میں اور ہائی کورٹ میں بھی اس بات پر Concede کیا تھا کہ چیئرمین کشمیر کونسل کو صدر آزاد کشمیر کو برطرف کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ تاہم باقی قانونی پوائنٹس پر میں نے دفاع کیا تھا، اس پر اپیل کو قابل اخراج قرار دیا تھا۔

اس کے خلاف میری شکایت لگائی گئی کہ اس وجہ سے حکومت آزاد کشمیر اور حکومت پاکستان کے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ سکندر حیات صاحب نے چیف سیکریٹری راحت اللہ جرال اور سیکریٹری ٹو پرائم منسٹر خلیل احمد قریشی کی موجودگی میں بلا کر مجھے کہا کہ ان لوگوں کو آپ کے خلاف شکایت ہے اور اس میں یہ مثال دی۔ میں نے کہا کہ میں آزاد کشمیر کی حکومتی پارٹی کا وکیل ہوں۔ اگر میں نے سردار ابراہیم صاحب کے کیس کی یہ کہہ کر مخالفت کروں کہ کشمیر کونسل کا چیئرمین آزاد کشمیر کے صدر یا حکومت کو برطرف کر سکتا ہے تو کل اگر ہماری حکومت کو برطرف کیا جائے تو اس کا میرے پاس یا آپ کے پاس کیا دفاع ہو سکتا ہے۔ میں نے ایک تو آئینی طور پر درست کیا ہے اور پھر ہماری پارٹی لائن بھی یہی ہونی چاہیے۔ اس پر سکندر حیات صاحب بہت خوش ہوئے اور ان کو کہا کہ اگر باقی کیس بھی ایسے ہی ہیں، تو یہ درست ہی کرتے ہیں اس طرح ہمارا مناقشہ کشیدگی میں بدلتے بدلتے رہ گیا۔

سپریم کورٹ میں سردار ابراہیم صاحب مرحوم کے کیس میں مجھے ان کا ایک واقعہ اکثر یاد آتا رہتا ہے جس سے ان کی بڑائی اور بے باکی پر ان کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے ہائی کورٹ کے جس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی تھی وہ دو ججز کا اختلافی فیصلہ تھا۔ ہائی کورٹ کے ***Procedure Rules*** کے تحت یہ تیسرے جج کے پاس جانا تھا جو جج اس وقت ہائی کورٹ میں تھا ہی نہیں۔ نہ معلوم سردار صاحب نے کس طرح اور کس کے کہنے پر سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ میں

107

نے سپریم کورٹ میں سردار صاحب کے اصولی اور قانونی موقف کو تسلیم کیا۔ البتہ اپیل پر یہ اعتراض کیا کہ یہ اپیل کسی فیصلے کے خلاف نہیں ہے بلکہ ایک رائے کے خلاف ہے جبکہ فیصلہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک تیسرا جج اس پر اپنا فیصلہ نہ دے اس وقت تک' یہ دو ججز کی محض رائے ہے جس کے خلاف اپیل نہیں ہو سکتی جس وجہ سے یہ اپیل نا قابل پذیرائی ہے۔ سردار صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ" جج صاحب گیلانی صاحب جو کچھ کہتے ہیں اللہ پاک کی قسم قانونی پوزیشن یہی ہے لیکن انہوں نے اپیل کے دیگر نکات پر تو میرا موقف تسلیم کیا، اور وہ بھی عین قانون کے مطابق ہے۔ آپ اس پر فیصلہ صادر کریں۔ ضیاالحق رحلت پا گیا ہے اس کا صرف جبڑا ملا ہے اس کی روح بھی ختم ہوگئی ہے، آپ بے خوف ہو کر فیصلہ کریں۔" یہ معاملہ ضیاالحق صاحب مرحوم کے جہاز کریش میں وفات کے بعد کا ہے۔ سردار صاحب نے مجھے باہر نکل کر گلے لگایا اور بہت سراہا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے بہت پیار کیا کرتے تھے۔ اپیل کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا اور ان کو صدارت کی بقیہ مدت کے سارے واجبات مل گئے۔ یہ فیصلہ سردار محمد ابراہیم خان بنام آزاد حکومت کے عنوان کے تحت [PLD 1990 SC AJ&K 23] میں رپورٹ ہے۔

1988-89 کے اواخر میں سردار محمد عبدالقیوم خان اور سکندر حیات خان مجھے سیکریٹری قانون تعینات کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے متعدد بار انہوں نے کہا لیکن میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ آج آپ جیسے قد کاٹھ والے لیڈروں کے ساتھ تو میں چل سکتا ہوں لیکن آپ کی جگہ لینے کے لیے جو لوگ انتظار میں ہیں، میں ان کی فائلیں پکڑ کر ان کے پیچھے نہیں چل سکتا۔ سول بیوروکریسی میں ان پڑھ، نمبرداروں اور علاقہ زدہ حکمرانوں کے ساتھ کام کرنا کارے دارد والی بات ہے۔ یہ لوگ سول بیوروکریسی کو حکومت کا نہیں بلکہ اپنا ذاتی ملازم سمجھتے ہیں جو تسلیم کرنا کسی غیرت مند انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

جس دن میری ایڈووکیٹ جنرل تقرری ہوئی اس روز (راجہ عبدالخالق مرحوم) جو سیکریٹری سروسز تھے، مجھے اسلام آباد میں ایک کیفے میں لے گئے۔ نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ "اب آپ نے کسی

نہ کسی طور سرکاری عہدے پر رہنا ہے، یاد رکھنا کہ جس کا کام ہونے والا ہو جلدی کریں، اور جس کا نہ ہونے والا ہو اس سے خندہ پیشانی سے فوراً معذرت کریں تاکہ ہونے والے کو کام کا فائدہ جلدی مل سکے اور نہ ہونے والا کوئی اور چارہ جوئی کرے۔''

اس طرح کی ایک نصیحت مجھے علی محمد وٹالی صاحب کی بیگم نے کی جب وہ لاہور سے ملنے مجھے مظفرآباد آئی تھیں۔ انہوں نے میرے گھر کی سادگی کو دیکھ کر کہا کہ ''سرکاری عہدے پر رہتے ہوئے زندگی ایسے گزارنا کہ جب یہ نہ رہے تو اس کی کمی محسوس نہ ہو۔'' یہ باتیں میرے لیے زادِراہ بن گئیں اور ہر عہدے پر زندگی ایسے ہی گزاری۔

1985ء کی مسلم کانفرنس کی حکومت میں اعلیٰ عدلیہ

جسٹس عبدالمجید ملک صاحب کی 1978 میں جب ہائی کورٹ میں تقرری ہوئی تھی، وہ اس وقت لبریشن لیگ کے سیکریٹری جنرل تھے۔ ان کو جنرل فیض علی چشتی کی ذاتی دلچسپی اور صراف صاحب کی پسندیدگی کے باعث جج تعینات کیا گیا تھا۔ اپنی اہلیت اور قابلیت کی بنیاد پر بھی یہ اس کے حق دار تھے۔ ان کے ساتھ ہی سردار سید محمد خان صاحب مرحوم ریٹائرڈ چیف جسٹس آزاد جموں وکشمیر کو بھی جج تعینات کیا گیا تھا جن کی کوئی سیاسی وابستگی نہ تھی۔ البتہ اپنے وقت کے نامور قانون دان تھے۔ ان صاحبان کی تقرری سے آزاد کشمیر کی عدلیہ کے وقار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ سردار قیوم صاحب نے ملک صاحب کی تقرری پر اس وقت بھی اعتراض کیا تھا کیوں کہ لبریشن لیگ کے ساتھ سردار صاحب کی جناب خورشید حسن خورشید مرحوم کی وجہ سے کافی اَن بن تھی۔ سردار صاحب کی وجہ سے ان کی جماعت والوں کو بھی ملک صاحب کے خلاف تحفظات تھے۔ تاہم ملک صاحب نے جنرل حیات خان صاحب کے دور میں ان لوگوں کو بھرپور ریلیف دیا اگرچہ ان کے فیصلے زیادہ تر سیاسی مقاصد کے لیے ہوتے تھے۔

ان کی اس کارکردگی سے 1985 میں بننے والی حکومت کافی خائف تھی۔ ادھر ملک صاحب بھی بطور جج اور بطور چیف جسٹس ہائی کورٹ سیاست بازی سے باز نہیں رہتے تھے۔ اس لیے سردار

100

سکندر حیات کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ ان کو ہائی کورٹ کی چیف جسٹس شپ[107] سے ہٹا کر سپریم کورٹ میں بطور ایڈہاک جج بھیجا جائے جبکہ سردار قیوم صاحب کو خواہش تھی کہ ملک صاحب ہائی کورٹ میں ہی موجود رہیں کیوں کہ اس سے ان کے مقاصد کی تکمیل ہوتی تھی یعنی کہ وہ سکندر حیات کی حکومت کو زیر بار رکھنا چاہتے تھے۔ سردار قیوم صاحب نے مجھے ملک صاحب کو اس بارے میں آگاہ کرنے کو کہا کہ حکومت کی خواہش ہے کہ ان کو سپریم کورٹ میں بطور ایڈہاک جج بھیجا جائے۔ میں نے ملک صاحب کو اس سے آگاہ کیا۔ میرے خیال میں انہوں نے اس سلسلے میں کافی تگ و دو کی کہ اس کو رکوایا جائے جس سلسلے میں اس وقت کے سیکریٹری انچارج کشمیر امور صفدر کاظمی صاحب نے سکندر حیات کو فون پر بتایا اور خط بھی لکھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ حکومت نے بحیثیت ایڈووکیٹ جنرل مجھ سے رائے مانگی۔ میں نے تحریری طور پر جواب دیا کہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو بطور ایڈہاک جج سپریم کورٹ بھیجنا ان کی اس عہدے سے برطرفی کے مترادف ہے اور یہ صرف سپریم جوڈیشل کونسل کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے لیکن سکندر حیات صاحب اپنے ارادے کے پکے اور فیصلے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے عادی تھے۔ آخرکار انہوں نے یہ تقرری عمل میں لائی۔

مجھ سمیت بہت سے لوگوں نے ملک صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ اس تقرری کو اپنی عزت اور آئین کے خلاف سمجھتے ہیں تو آپ استعفیٰ دے دیں یا چھٹی پر چلے جائیں لیکن انہوں نے یہ تبدیلی قبول کر لی۔ حکومت کی خواہش تھی کہ وہ سردار محمد اشرف صاحب کو ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنائیں جو ملک صاحب کے بعد ایکٹنگ چیف جسٹس بنائے گئے جن کو بعد ازاں سپریم کورٹ کا مستقل جج بنایا گیا اور اپنی تاریخ ریٹائرمنٹ اور اس کے بعد بھی وہ چیف الیکشن کمشنر کے عہدے پر فائز رہے۔

سردار محمد اشرف صاحب شریف النفس آدمی تھے عدالتی فیصلے تو انہوں نے مشکل سے کُل مقدمات کا ایک فیصد بھی نہیں کیے ہوں گے لیکن جو کیے بہت اچھے کیے۔ وہ بحیثیت جج اچھی شہرت کے حامل تھے البتہ بحیثیت چیف الیکشن کمشنر ان کی شہرت کافی متاثر ہوئی بالخصوص ان کی اس عہدے سے برطرفی باوقار طریقے سے نہیں ہوئی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں جو عدالتی چارہ جوئی کی اس کے باعث ان

کی عزت میں اور کمی آئی۔ اعلیٰ عدلیہ کے لوگوں کو اپنے منصب اور ادارے کے وقار کا خیال رکھ کر گندگی میں پتھر مارنے کی بجائے باوقار طریقے سے الگ ہو جانا چاہیے بجائے اس کے کہ وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے کوئی قانونی چارہ جوئی کریں اور وہ بھی ان لوگوں کے پاس جو اس ساری سازش کا حصہ ہوں۔

اس عرصہ کے دوران مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت آ گئی جس نے سکندر حیات کی حکومت کو ناکام کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے جن میں فنڈز کا روکنا اور ترقیاتی کام سوشل ایکشن پروگرام اور دیگر طریقوں سے اپنے کارکنان کے ذریعہ کرانے سے اسی دوران آزاد کشمیر حکومت کی برطرفی کے منصوبے باندھے جا رہے تھے۔ اس سلسلہ میں اس وقت کے چیف جسٹس آزاد کشمیر راجہ محمد خورشید خان کے بطور منتظم اعلیٰ بننے کی خبریں عروج پر تھیں۔ اس وجہ سے مسلم کانفرنس کی حکومت اور راجہ محمد خورشید خان میں ایک کشیدگی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ مرکز میں اس وقت میر باز کھیتران وزارتِ امورِ کشمیر کے وزیر تھے، ان کے چند بیانات اور جسٹس راجہ محمد خورشید خان کی لندن سے واپسی پر ایک بیان نے اس افواہ کو مزید تقویت پہنچائی۔ مسلم کانفرنس کے کارکنان بالخصوص راجہ فاروق حیدر خان جو اس وقت حکومت میں سینئر وزیر کے طور کام کرتے تھے۔ اس سلسلے میں بیان بازی میں پیش پیش تھے۔

میں نے بحیثیت ایڈووکیٹ جنرل میر باز کھیتران کے خلاف سپریم کورٹ آزاد کشمیر میں توہین عدالت کی درخواست دائر کر دی۔ مجھے راجہ محمد خورشید خان چیف جسٹس نے پوچھا کہ اگر یہ بات درست بھی مان لی جائے کہ چیف جسٹس آزاد کشمیر کو آزاد کشمیر کا صدر اور منتظم اعلیٰ بنایا جا رہا ہے تو اس سے سپریم کورٹ یا چیف جسٹس کا وقار کیسے مجروح ہوتا ہے اور یہ کس طرح توہین عدالت بنتی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ''جنابِ عالی، آئین میں کوئی ایسی گنجائش موجود نہیں کہ چیف جسٹس یا کوئی جج منتظم اعلیٰ بن سکے جبکہ اس بیان سے مغائر تاثر دے کر چیف جسٹس کی آئینی اور قانونی حیثیت پر حرف لایا جا رہا ہے کہ اس آئینی پوزیشن کے باوجود وہ ایسا بن رہا ہے یا بننے کے لیے آمادہ ہے اور آپ کے ساتھ منسوب بیان نے معاملہ مشکوک بنا دیا ہے۔'' میری اس درخواست اور دلیل نے ماحول میں کافی ارتعاش پیدا کیا۔ ادھر راجہ خورشید صاحب کے خلاف افواہ چھوڑی گئی کہ ان کے خلاف بددیانتی پر مبنی

الزامات کی بنا پر ریفرنس دائر کیا جا رہا ہے جس سے وہ کافی پریشان ہو گئے اور سردار قیوم صاحب کے پاس اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے دھیرکوٹ کے مقام پر پارٹی کے ایک جلسے میں پہنچ آئے جہاں پر سکندر صاحب اور باقی ہم سارے لوگ بھی موجود تھے۔ راجہ صاحب کو راجہ فاروق حیدر نے زیادہ لتاڑا۔ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ راجہ صاحب کے خلاف ریفرنس دائر کیا جا رہا ہے اور میرے خیال میں ایسی کوئی بات تھی بھی نہیں، یہ راجہ صاحب پر نفسیاتی دباؤ بڑھانے کے لیے اعلیٰ سطحی کوئی سیاسی چال تھی جس سے راجہ صاحب بہت پریشان ہو گئے۔

راجہ صاحب کے خلاف ایسا ہونا بھی نہیں تھا کیوں کہ وہ سردار قیوم صاحب کے پروردہ اور ان سے گہرے روابط رکھتے تھے۔ آزاد کشمیر میں ریفرنس صرف وادی والے ججوں کے خلاف ہی ہو سکتا ہے جن کے پس پشت کوئی سیاسی طاقت نہیں صرف اپنا میرٹ ہوتا ہے۔

1985ء کے الیکشن منشور میں مسلم کانفرنس نے مہاجرین کو متروکہ جائیداد کے حقوق ملکیت منتقل کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن حکومت بنانے کے بعد کسی اور مصلحت کا شکار ہو گئی کہ یا تو یہ معاملہ چھیڑا ہی نہ جائے یا سب سے برابر باہمی قیمت وصول کی جائے۔ میری مشاورت پر مہاجرین کو اس شرط پر مفت حقوق ملکیت دینے کا فیصلہ کیا گیا کہ جب یہ لوگ زمین فروخت کریں گے تو اس وقت اس کی قیمت مشتری سے لی جائے گی۔

الیکشن 1990

1990ء کے اوائل میں اسمبلی کے آئندہ انتخابات کی جب تیاریاں شروع ہوئیں تو نئی صف بندیاں اور محفوظ حلقوں کی تلاش شروع ہو گئی۔ سکندر حیات صاحب کی خواہش تھی کہ وہ مہاجرین جموں کے حلقہ نمبر 6 راولپنڈی سے الیکشن لڑیں اور اپنی آبائی مقامی سیٹ سے اپنے بھائی سردار نعیم خان کو اسمبلی میں لائیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں قانونی مشیروں سے مشاورت شروع کر دی۔ اس سلسلے میں ان کے معتمد خاص لوگ ریٹائرڈ جسٹس ملک محمد اسلم مرحوم جو اس وقت پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین تھے

اور راجہ بشیر خان سیکریٹری قانون (وقت) تھے۔ ایک اجلاس میں ان کے ساتھ مجھے بھی بلایا گیا اور سب کی الگ الگ رائے لی گئی۔ میری رائے تھی کہ وہ قانونی طور پر ایسا نہیں کر سکتے اور سیاسی طور پر انہیں ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے۔ میں نے ان سے کہا کہ چوں کہ وہ نکیال سے ممبر اسمبلی ہونے کی وجہ سے آزاد کشمیر کے وزیر اعظم ہیں اور وہی ان کی سکونت ہے۔ اگر اب وہ جموں 6 سے الیکشن لڑیں گے تو ان کو وہاں کا سکونتی ہونے کے ثبوت اور بیان حلفی دینا پڑے گا جو ممکن نہیں ہے۔ نیز یہ بات بھی قانونی طور پر مشکوک ہے کہ مہاجرین کے حلقہ سے آزاد کشمیر کا کوئی سکونتی الیکشن لڑے۔ سیاسی طور اس لیے مناسب نہیں ہے کہ ان کی ساری توجہ جموں 6 پر مرکوز ہو جائے گی جہاں پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران جاوید نظامی (مرحوم) ایک مضبوط امیدوار تھے۔ اس طرح آزاد کشمیر اور مہاجرین کی نشستوں پر وہ بحیثیت صدر جماعت توجہ نہیں دے سکیں گے۔

سکندر صاحب نے میری قانونی بات کا برا منایا اور دیگر دو قانون دانوں کی رائے سے اتفاق کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں مہاجرین کا وزیر اعظم بن سکتا ہوں تو ان کا ممبر اسمبلی کیوں نہیں؟ نیز انہوں نے میرے ساتھ ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا آپ میرے ایڈووکیٹ جنرل ہو کر میرے ہی خلاف دلیل دے رہے ہیں۔ جب ہم کمرے سے باہر نکلے تو مرحوم جسٹس ملک اسلم صاحب نے مجھے کہا کہ بھائی وہ شخص ایسا کرنے پر تیار بیٹھا ہے، تم کیوں اس کو ناراض کر رہے ہو۔ ملک صاحب بہت مخلص شخص تھے اور قانون دانی میں بھی ذہین سمجھے جاتے تھے لیکن یہاں سکندر صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی۔ قوموں کا زوال اس وقت شروع ہو جاتا ہے جب اس کے دانشور حکمرانوں کو اپنی دانست کے مطابق نہیں بلکہ ان کی خواہشات کے مطابق مشورہ دیں۔ یہی سکندر صاحب کے ساتھ ہوا۔ سکندر صاحب نے اپنی ضد کی تکمیل کرتے ہوئے جموں 6 سے الیکشن لڑ کر جیت تو لیا لیکن ان کی پارٹی ان کی عدم توجہی سے ہار گئی اور بعد میں ان کے خلاف رٹ ہوئی جہاں ان کو اسی گراؤنڈ پر ان سیٹ کیا گیا جو میں نے ان کو ابتدا میں کہا تھا۔ رٹ کے دوران انہوں نے مجھے اس رٹ کی پیروی کرنے کو کہا جس سے میں نے معذرت کی کیوں کہ یہی بات میں قانونی طور ان کو پہلے ہی کہہ چکا تھا جس کے ساتھ ہی میں نے اپنے

107 منصب سے استعفیٰ بھی دے دیا۔ اس وقت میرے استعفیٰ دینے کی یہ اصولی وجہ تھی۔ سکندر صاحب کو ان کے حلقہ نے مشتعل کرتے ہوئے باور کرانے کی کوشش کی کہ میں ہمیشہ سے ان کا مخالف رہا ہوں لیکن بالآخر ان کا تبصرہ تھا کہ ایسا ممکن ہے، لیکن مشورہ اس نے صحیح دیا تھا جو صحیح ثابت بھی ہوا۔

دورانِ سماعت مقدمہ پایا گیا کہ سکندر صاحب نے نکیال کے علاوہ کوٹلی اور راولپنڈی میں دو جگہوں پر اپنے ووٹ کا اندراج کرایا تھا، حالاں کہ قانون کے مطابق ووٹ صرف ایک ہی جگہ درج کرایا جا سکتا ہے اور اس میں بھی بیان حلفی دینا پڑتا ہے کہ اس ایک جگہ کے علاوہ کسی دیگر جگہ پر ووٹ درج نہیں ہے چوں کہ چار جگہوں کی سکونت کا حلفی بیان دینا پڑا۔ اس سے ان کی اخلاقی پوزیشن بھی بہت کمزور ہوئی گو کہ سیاست کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہیں جہاں ہر چیز جائز سمجھی جاتی ہے۔

ممتاز حسین راٹھور وزیر اعظم، سردار محمد عبدالقیوم خان صدر منتخب

مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔ آزاد کشمیر میں الیکشن کی یہ روایت رہی ہے کہ مرکز میں جس پارٹی کی حکومت ہوتی ہے، آزاد کشمیر میں عموماً اسی کی حامی یا اتحادی پارٹی الیکشن جیتتی ہے۔ ایک تو اس کے سیاسی اثرات خود بخود مرتب ہوتے ہیں اور پھر ہاتھ کی صفائی بھی ہوتی ہے۔ پاکستان کے سارے صوبوں میں پھیلی ہوئی مہاجرین کی نشستیں تو بہرحال اثر انداز ہوتی ہیں۔ 1990ء کے الیکشن بھی اس سے مختلف نہیں تھے پیپلز پارٹی اکثریتی پارٹی بن کر الیکشن جیتی جس کے نتیجے میں راجہ ممتاز حسین راٹھور (مرحوم) 29 جون 1990 کو آزاد کشمیر کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ اس وقت آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد عبدالقیوم خان تھے، انہوں نے راٹھور صاحب کا حلف لینے سے انکار کر دیا اور بالآخر سردار سکندر خان صاحب وزیر اعظم کے تحریری مشورے پر لکھا ”کہ پیپلز پارٹی کا کوئی کارکن ان کا حلف لے لے۔“ اس پر ممتاز حسین راٹھور، جو کہ بڑے ہی زیرک اور بذلہ سنج انسان تھے، نے کہا؛ ”جہاں مرغ اذان نہ بھی دے، صبح وہاں بھی ہو جاتی ہے۔“

متحارب پارٹیوں اور لیڈروں کے ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی کے باوجود سکندر حیات نے اپنی مدت وزارتِ عظمیٰ پوری کر کے عنانِ اقتدار ممتاز حسین راٹھور کے سپرد کر کے ان کے

گلے میں ہار ڈالا۔ یہ پاکستانی سیاست کی انوکھی مثال ہے اور یہ سلسلہ آزاد کشمیر میں تقریباً چلتا رہا ہے، یہاں کسی حد تک لوگوں میں مروت اور حیا ابھی موجود ہے۔ ممتاز راٹھور نے سردار قیوم صاحب کے بیٹے سردار خلیق احمد خان (مرحوم) کو اپنا مشیر خصوصی مقرر کیا جبکہ اس سے پہلے سردار قیوم صاحب راٹھور صاحب اور ان کی کابینہ کا حلف لینے سے بھی انکار کر چکے تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ سردار عبدالقیوم خان صاحب تحریک کشمیر اور الحاق پاکستان کے کارڈز کو انتہائی کامیابی اور چابک دستی سے استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں اور اس کی بنیاد پر ہمیشہ اقتدار کے مزے لوٹتے رہے ہیں، خواہ حکومت میں ہوں یا نہ ہوں۔ اب کی بار بھی پیپلز پارٹی کی حکومت اور اسمبلی میں اکثریت کے باوجود وہ 30 ستمبر 1990 کو آزاد کشمیر کے صدر منتخب ہو گئے۔ سکندر حیات نے اپنی گزشتہ پانچ سالہ حکومت میں سردار صاحب کو کافی زچ کر رکھا تھا اور ان کو مع ان کے فرزندار جمند عتیق احمد خان کے حصہ دار تو دور کی بات ہے کسی چیز میں راز دار بھی نہیں بننے دیا جس کا سردار صاحب کو تو کم لیکن ان کے عزیز و اقارب بالخصوص ان کے بیٹوں اور باقی عزیزوں کو بہت صدمہ تھا۔ اس وجہ سے ان لوگوں نے راٹھور صاحب کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور راٹھور مرحوم نے بھی ان کی بھرپور دل جوئی کی۔ تاہم سردار قیوم صاحب اپنی حاضری ڈالنے کے لیے پیپلز پارٹی کے خلاف بیان بازی کرتے رہے۔

راٹھور صاحب کی کابینہ کا ہر فرد بزعم خود اپنے آپ کو وزیر اعظم سمجھتا تھا اور نہ صرف اپنی وزارت بلکہ دیگر وزارتوں کے اختیارات بھی استعمال کرتا تھا۔ ہر وزیر، مشیر اور پارٹی سے تعلق رکھنے والا ہر ممبر اسمبلی اپنے حلقہ کا وزیر اعظم ہوا کرتا تھا۔ اس وجہ سے ان کی حکومت عدم ڈسپلن اور انتشار کا شکار رہی۔ وزرا آپس میں اور وزیر اعظم کے ساتھ دست و گریباں رہے جس کا بھرپور فائدہ مسلم کانفرنس نے اٹھایا۔ سردار قیوم صاحب سے تعلق رکھنے والے مسلم کانفرنس کے کارکنان اس حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے تھے۔ اس انتشار کی وجہ سے راٹھور صاحب حکومت چلانے کے قابل نہ رہے اور انہوں نے خود صدر کو مشورہ دے کر اسمبلی کو تحلیل اور اپنے تمام وزرا کو برطرف کر دیا۔ وزرا کے خلاف انہوں نے کرپشن، بد دیانتی، بدکرداری اور بلیک میلنگ کے تحریری الزامات لگائے لیکن بعد میں ان ہی سب وزیروں کو نئے

الیکشن تک ان ہی پورٹ فولیوز کے ساتھ اپنا مشیر مقرر کر دیا۔ یہ عجیب طرز عمل تھا جو کسی سیاسی کارکن اور وہ بھی حکمران کو زیب نہیں دیتا۔ اگر وہ لوگ غلط تھے تو ان کو دوبارہ اپنا مشیر نہیں رکھنا چاہیے تھا اور اگر اچھے تھے تو ان پر کرپشن اور بلیک میلنگ کا الزام اور اس وجہ سے اسمبلی تحلیل نہیں ہونی چاہیے تھی۔

کشمیری حریت پسندوں کی آمد

1990ء میں سکندر حیات کی حکومت کے دوران ہی مارچ 1990 کے مہینے میں، میں نے ایڈووکیٹ جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور وکالت شروع کر دی۔ مسلم کانفرنس کے سرگرم کارکن کی حیثیت سے متحرک بھی تھا۔ اس عرصہ کے دوران مقبوضہ کشمیر میں تحریک مزاحمت کی وجہ سے کشمیر کے ہزاروں نوجوان آزاد کشمیر آ رہے تھے اور ادھر سے واپس بھی جا رہے تھے۔ ان کی آمدورفت 1988 سے ہی شروع ہوئی تھی لیکن تشہیر نہیں ہوئی تھی۔ ان میں سے ضلع بارہ مولہ، کپواڑہ اور سری نگر سے تعلق رکھنے والے کئی لوگ میرے واقف کاروں یا رشتہ داروں اور دوستوں کے بھائی بیٹے تھے، ان کی میزبانی میں اپنا اخلاقی فریضہ سمجھ کر کرتا تھا۔ میں اپنی وکالت اور سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ان لوگوں کے ساتھ کافی مصروف تھا۔ مجھے حیرانی ہوتی تھی کہ کمسن بچے بغیر سوچے سمجھے کیا کر رہے ہیں؟ ان میں سے اکثر پڑھے لکھے لوگ تھے اور عام کشمیریوں کی طرح وہ بھی ہندوستان کے شدید مخالف تھے لیکن کمسن بچوں کو ان کے ماں باپ کس طرح سفر اور اس مشقت کی اجازت دیتے تھے، یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ بعد میں کشمیر جانے پر پتہ چلا کہ آسودہ حال اور ہندوستان نواز لوگ بھی اپنے بچوں کو تحریک میں شامل کر کے اس وقت کے کلچر کا حصہ بن رہے تھے۔ کلاشنکوف ایک مرتبہ کی علامت بن گیا تھا۔

سردار قیوم صاحب نے ان لوگوں کو اس زمانے میں بہت سنبھالا دیا۔ سکندر صاحب کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں قائم کیا ہوا کشمیر لبریشن سیل تقریباً سردار قیوم صاحب کی ہی زیر نگرانی تھا، اس کے زیر اہتمام ان لوگوں کی پرورش اور دیکھ بھال ہوتی تھی۔ سردار صاحب نے اپنی بساط سے بھی بڑھ

کران لوگوں کی ضروریات کو پورا کیا۔ ان میں سے اکثریت وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی تھی اور سردار قیوم صاحب کے ویلی والوں کے بارے میں ہمیشہ تحفظات رہے ہیں لیکن ان لوگوں کی حد تک انہوں نے کوئی ایسی بات سامنے نہیں آنے دی۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں مرکزی حکومت ہر لحاظ سے اثر انداز ہوتی تھی اور ان لوگوں کا مرکزی حکومت کے عہدیداران سے تعلق پیدا ہو گیا ہوا تھا، اس لیے مقامی سطح پر ان کی پذیرائی کرنا سب کی ذمہ داری بن گئی تھی۔ تاریخ بھی اپنا نیا باب رقم کر رہی تھی۔ نفی کا دور ختم ہو کر اثبات کا دور شروع ہو گیا تھا اور سردار صاحب نے اپنی سیاست اسی انداز میں چلانا شروع کر دی۔ سردار صاحب چوں کہ سارا عرصہ اقتدار کی سیاست کرتے رہے، الہٰذا اب حصولِ اقتدار اور اس کے دوام کا راستہ ان لوگوں کے ذریعہ ہی تھا۔ اس لیے اس کا انہوں نے ہر لحاظ سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ جن کو زندگی بھر غدار اور جاسوس کہہ کر سیاست کرتے رہے، ان کی کروٹ بدلنے سے اب ان کو محب وطن، مجاہد اور جانباز کہہ کر سیاست شروع کر دی اور بہت کامیابی سے ریاست کے مقبوضہ حصے میں بھی متعارف ہو گئے۔

ممتاز راٹھور صاحب کی حکومت کے دوران سردار صاحب نے اپنے معتمد خاص اشخاص کے ذریعہ مرکزی حکومت کو مختلف یادداشتیں بھجوائیں۔ ان لوگوں میں سے میرے علاوہ عبدالرشید عباسی، سردار سیاب خالد، الطاف کیانی، منیر اعوان مرحوم اور ارشد گیلانی وغیرہ تھے۔ سردار صاحب کہا کرتے تھے کہ جس قدر ہو سکے، مرکزی حکومت کے ذمہ داروں کو پیپلز پارٹی اور اس کی حکومت کے خلاف الزامات لگا کر یادداشتیں ٹیلی گرام اور خطوط لکھیں۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ تسلسل سے لکھے جانے والے خطوط یقیناً کسی وقت اثر پذیر ہو جاتے ہیں۔ میں، رشید عباسی اور سیاب خالد چارج شیٹ پر چارج شیٹ لکھ کر بھیجا کرتے تھے جن کی نقول میں اپنی دستاویزات میں رکھتا تھا جو 8 اکتوبر 2005 کے زلزلہ کی وجہ سے متاثر بھی ہوئی ہیں، لیکن اکثر قابل مطالعہ ہیں۔ میں حیران ہوتا تھا کہ ایک طرف تو سردار صاحب اس ریاست کے صدر ہیں جس کے ممتاز راٹھور وزیر اعظم اور ان کا بیٹا راٹھور صاحب کا مشیر اور ان کے دیگر عزیز و اقارب ان کا بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں تو پھر آخر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟

107

درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

وسط مدتی الیکشن، ممتاز حسین راٹھور برطرف، سردار صاحب کا وزیر اعظم اور میرا جج بننا

راٹھور صاحب کی دورانِ حکومت اکتوبر 1990 میں جب پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہو کر عبوری طور جناب غلام مصطفیٰ جتوئی نگران وزیر اعظم پاکستان اور جنرل (ر) عبدالمجید ملک کشمیر کی وزارت کے انچارج وزیر تھے، میری اور جسٹس ریاض اختر چوہدری کی صدر آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم خان صاحب کی تجویز پر بحیثیت جج ہائی کورٹ تقرری کی ایڈوائس جاری ہوئی۔ میری بطور مستقل جج اور ریاض اختر چوہدری صاحب کی بطور ایڈیشنل جج جو اس وقت ہائی کورٹ کے مستقل جج بشارت احمد شیخ صاحب کی سپریم کورٹ میں ایڈہاک جج تقرر ہونے کی وجہ سے عارضی طور پر خالی ہونے والی آسامی کے خلاف تجویز ہوئی تھی۔ ایڈوائس پر تقرری کا باقاعدہ نوٹیفکیشن صدر آزاد کشمیر کی منظوری سے حکومت آزاد کشمیر کا محکمہ قانون جاری کرتا ہے۔ جب یہ ایڈوائس سیکریٹری قانون کے پاس گئی تو انہوں نے ریاض اختر صاحب کی حد تک یہ اعتراض کیا کہ ان کا نام ہی چیف جسٹس ہائی کورٹ نے پینل میں نہیں رکھا، اس لیے اس حد تک ایڈوائس پر عمل نہیں ہو سکتا؟ اس پر سردار صاحب نے اپنی قلمی حکم نامہ لکھا کہ ''میں نے اس وقت کے چیف جسٹس سے مشورہ کر لیا تھا'' یہ بات انہوں نے بالکل غلط لکھی کیوں کہ ان کے ساتھ مشورہ ہوا تھا اور نہ ہی ریکارڈ پر ایسی کوئی بات موجود تھی اور اس کے بعد سردار اشرف صاحب جو کہ اس وقت چیف جسٹس ہائی کورٹ ہوا کرتے تھے، نے برملا کہا کہ مجھ سے کبھی ان کے بارے میں کسی نے مشورہ نہیں کیا اور نہ ہی اس میں میرے رائے شامل تھی۔ راٹھور صاحب کی حکومت میں میر پور سے ریاض اختر صاحب کی برادری سے تعلق رکھنے والے وزرا موجود تھے جنہوں نے راٹھور صاحب سے ان کی حد تک نوٹیفکیشن جاری کروا دیا لیکن مظفر آباد سے تعلق رکھنے والے وزیروں، جن میں میاں غلام رسول' خواجہ فاروق احمد اور چوہدری لطیف اکبر پیش پیش تھے، نے میرا نوٹیفکیشن جاری نہیں ہونے دیا۔ ممتاز راٹھور صاحب کے ساتھ میرا ذاتی تعلق تھا، انہوں نے

مجھے فون کر کے یہ ساری صورتِ حال بتا دی۔ انہوں نے جو الفاظ کہے وہ ہو بہو یہ ہیں کہ ''میر پور کے سارے جاہل اور جٹ اور مظفر آباد کے سارے خسیس اور بٹ آپ کے مخالف اور ریاض اختر کے حق میں ہیں، اس لیے یا تو آپ ان کو منائیں ورنہ میں اپنی نوکری بچانے کی خاطر آپ کا نوٹیفکیشن جاری نہیں کروں گا۔''

میں نے راٹھور صاحب کو جواباً کہا کہ ''راٹھور صاحب آزاد کشمیر کی تیس لاکھ آبادی میں سے صرف 6 یا 7 سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج ہیں جبکہ باقی سب لوگ بھی ججوں سے زیادہ باعزت زندگی گزار رہے ہیں، میں نے اگر ان لوگوں کی احسان مندی سے نوٹیفکیشن جاری کرانا ہے تو کل ان کے کہنے پر سب کچھ کرنا ہوگا، اس لیے خدا پر چھوڑ دیں۔ جو اللہ پاک نے کرنا ہوگا ہو جائے گا۔ ممکن ہے یہی لوگ نہ رہیں اور میں اور آپ رہ جائیں۔ اس طرح ریاض اختر صاحب کا ایڈیشنل جج ہائی کورٹ کا نوٹیفکیشن جاری ہو گیا۔ اللہ پاک کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کے دو یا تین ماہ کے اندر اندر ہی راٹھور صاحب نے اسمبلی تحلیل کر دی اور اس کے بعد میرا نوٹیفکیشن تقرری بطور مستقل جج ہائی کورٹ بھی جاری ہو گیا۔ اس وقت راٹھور صاحب آزاد کشمیر کے آئین کے مطابق بطور قائم مقام وزیر اعظم اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ کابینہ کے وہی لوگ ان کے مشیر مقرر ہوئے جو کہ پہلے وزیر تھے لیکن یہ لوگ اب بے اثر اور بے توقیر ہو گئے تھے۔ محض اپنی نوکری اور جھنڈی سنبھالے ہوئے سرکاری خرچ پر اپنی انتخابی مہم چلا رہے تھے۔

میرے نوٹیفکیشن جاری ہونے کے دن ہمارے چیف جسٹس ملک عبدالمجید صاحب معہ دیگر دو ججز صاحبان کوٹلی کے دورہ پر تھے، اس لیے مجھے حلف لینے کے لیے کوٹلی جانا پڑا۔ لیکن اس سے پہلے میں نے چوہدری شیر زمان صاحب کو فون کر کے پوچھا کہ کیا کیا جائے مجھے خدشہ تھا کہ کہیں ریاض اختر صاحب ملک مجید صاحب کو ایسی پٹی نہ پڑھا دیں کہ وہ مجھ سے حلف ہی نہ لیں۔ چوہدری شیر زمان صاحب نے مجھے کہا کہ آپ کوٹلی آئیں، ملک صاحب حلف کس طرح نہیں لیں گے۔ اس لیے میں کوٹلی چلا گیا اور غالباً 6 مئی 1991 کو کوٹلی کے مقام پر میرا بطور مستقل جج ہائی کورٹ حلف ہوا۔

اعلیٰ عدلیہ کے جج حکومت کے ملازم نہیں ہوتے بلکہ ریاست کے آئین اور لوگوں کے حقوق کے امین ہوتے ہیں، جو غیر معمولی صلاحیتوں، قابلیت اور کردار کے حامل ہونے چاہئیں۔ اگر اس معیار پر دیکھا جائے یا متحد ہندوستان میں اعلیٰ عدلیہ کے ججوں معیار کو دیکھا جائے تو میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن ہم عصر لوگوں کو جج بننے کی تگ و دو اور عدلیہ میں موجودگی کو دیکھ کر میں بھی اپنے جج ہونے پر مطمئن تھا، وگرنہ ایسا ہونا میرے وہم وگمان میں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

سردار عبدالقیوم خان بحیثیت صدر و وزیر اعظم

اسمبلی کی تحلیل کے بعد نئی اسمبلی میں سردار عبدالقیوم صاحب نے صدارت سے استعفیٰ دیا اور علما و مشائخ کی نشست پر منتخب ہو کر 2 جولائی 1991 کو آزاد کشمیر کے وزیر اعظم اور سردار سکندر حیات 22 اگست 1991 کو صدر بنے۔ اس طرح وہ افراتفری کا دور تو ختم ہوا لیکن سردار عتیق احمد خان کے اتھل پتھل کی وجہ سے افراتفری کا نیا دور شروع ہوا جس نے سردار عبدالقیوم خان صاحب کے وقار کو بہت مجروح کیا کیوں کہ اصل اختیارات عتیق احمد خان استعمال کرتے تھے جن میں انصاف نام کی کوئی بات نہیں تھی۔ سردار قیوم صاحب آزاد کشمیر میں ہی نہیں بلکہ پورے پاکستان میں بڑے قد کاٹھ کے آدمی سمجھے جاتے ہیں۔ بحیثیت صدر انہوں نے مبینہ طور پر 1970 تا 1975 میرٹ، انصاف اور قانون کی حکمرانی کے حوالے سے بڑا نام پیدا کیا اور لوگ اس حوالے سے ان کے بہت ہی معترف ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس کا تجربہ نہیں ہے کیوں کہ میں اس عرصہ میں مقبوضہ کشمیر میں تھا لیکن میں نے کسی شخص سے سردار صاحب کے خلاف اس عرصہ کے حوالے سے کوئی بدانتظامی یا ناانصافی کی بات نہیں سنی۔

1991ء میں جب سردار قیوم صاحب وزیر اعظم بنے تو لوگوں کو ان کے گزشتہ عرصہ کی کارکردگی کے حوالے سے بہت امیدیں وابستہ تھیں لیکن اس عرصہ کے دوران سردار صاحب کی کوئی Liabilities اور ذاتی دلچسپیاں نہیں تھیں۔ ان کے اپنے بچے غالباً زیر تعلیم تھے اور سن بلوغت کے اس درجہ پر نہیں پہنچے تھے کہ ان پر اثر انداز ہو سکیں اور نہ ہی اپنے بھائی سردار عبدالغفار خان صاحب مرحوم

کوسردار صاحب نے اپنے اوپر اثر انداز ہونے دیا جبکہ اب کی بار یہ سارے لوگ سیاست اور اقتدار میں شریک بن گئے اوران کی ذاتی اور کاروباری دلچسپیاں غالب آ گئی تھیں۔ اپنی ذات یا جماعت کے علاوہ سردار صاحب پر خاندانی اثر ورسوخ اور اقتدار کو بڑھانے اور طول دینے کا واہمہ غالب آ چکا تھا۔

اس عرصہ کے دوران یعنی 1985 والی اسمبلی میں الیکشن جیت کر وزیر اعظم نہ بن سکنے کے بعد خود صدر منتخب ہوئے اور اپنی سیٹ پر اپنے بھائی سردار عبدالغفار خان کو منتخب کرایا جس کو سارا عرصہ سردار سکندر حیات خان نے ان کے اور ان کے بیٹے سردار عتیق احمد خان کے خلاف بھر پور طریقے سے استعمال کیا۔ تاہم سردار سکندر حیات خان کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں اور انتظامیہ پر مکمل کنٹرول کی وجہ سے وہ حکومت کی کارکردگی میں کسی طور مخل نہیں ہو سکے۔

1990 کے اسمبلی انتخابات میں سردار عبدالغفار خان کے علاوہ سردار صاحب نے اپنے بیٹے عتیق احمد خان کو بھی اسمبلی کا ممبر منتخب کرایا اور ان کا دوسرا بیٹا سردار خلیق احمد خان (ممتاز راٹھور کے دوران حکومت میں مشیر حکومت رہا) ان کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں مشیر مقرر ہوا۔ جب 1991 میں راٹھور صاحب نے اسمبلی تحلیل کر دی اور اسمبلی کے نئے الیکشن ہوئے تو سردار قیوم خان صاحب نے اپنے بھائی کو آزاد کشمیر اور بیٹے عتیق احمد خان کو کراچی سے مہاجرین جموں کی نشستوں پر منتخب کروایا۔ اس عرصہ کے دوران عملی طور پر وزیر اعظم سردار عتیق احمد خان ہی تھے اور حکومت کے سیاہ اور سفید کے وہی مالک تھے۔ مبینہ طور پر سردار قیوم صاحب کی تمام فائلوں پر عتیق خان ہی ان کے دستخط کیا کرتے تھے اور سردار صاحب نے ان کو اس سلسلہ میں مکمل اجازت دی ہوئی تھی۔

اسی طرح ان کے بھائی سردار غفار خان اور دوسرے بیٹے سردار خلیق خان مرحوم اپنی اپنی دلچسپیوں کے دائرہ میں کلی حیثیت کے مالک تھے۔ خلیق صاحب حکومتی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے تاہم حکومت کی مدد سے اپنے کاروبار کو فروغ دے رہے تھے۔ سردار قیوم صاحب کا یہ دور انتظامی اور مالی بدعنوانیوں کے لحاظ سے آزاد کشمیر کی سیاسی تاریخ کا بدترین دور تھا۔ سردار صاحب اس عرصہ کے دوران فضاؤں میں ہی رہتے تھے۔ آزاد کشمیر کے وزیر اعظم ہونے کے باوجود آزاد کشمیر

کے مختلف اضلاع میں ایک آدھ دن کے لیے محض دورے پر اور وہ بھی ہیلی کاپٹر کے ذریعہ ہی جاتے تھے کیوں کہ 1992 کے تباہ کن سیلاب کی وجہ سے آزاد کشمیر کی تقریباً ساری سڑکیں کھنڈرات کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ مقبوضہ کشمیر میں مزاحمتی تحریک کے باعث سردار صاحب اسلام آباد اور بیرون ممالک میں کافی مصروف رہتے تھے جبکہ حکومت کا نظم ونسق سردار عتیق احمد خان ہی چلاتے تھے۔

ایک دن جب میں سردار صاحب کے ساتھ ان کی خواہش پر مانسہرہ جا رہا تھا، ان سے کہا کہ آپ عتیق صاحب کو وزیر بنا لیں تا کہ حکومت میں اس کا عمل دخل رہے اور ایک اجنبی کے طور اس کی مداخلت سے حکومت کی جو بدنامی ہو رہی ہے، وہ نہ ہو۔ سردار صاحب نے مجھے کہا کہ اس کو میں نے عملدرآمد پر لگایا ہے اور وہ سب سے اچھا کام ہے کیوں کہ بغیر کسی جواب دہی کے وہ سارے کام کرتا ہے۔

عتیق کمیشن

ان دنوں تقریباً چار سو سے زائد تقرریوں کے خلاف جو کہ سردار عتیق احمد خان نے خلاف میرٹ خالصتاً سیاسی بنیادوں پر اپنے کارکنان کی ایڈہاک بنیادوں پر کی تھیں، جن کو اسمبلی ایکٹ کے ذریعہ Regularise کر دیا تھا، بہت شور شرابہ تھا اور ہائی کورٹ میں بہت سی Writ Petitions زیر کار تھیں جن میں سے بہت سی میرے پاس تھیں۔ میرے خیال میں سردار صاحب نے غالباً اسی وجہ سے مجھے بات کرنے کے لیے مانسہرہ جاتے ہوئے ساتھ بٹھایا تھا۔ جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اسمبلی کے درج بالا ایکٹ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تو میں نے برملا کہا کہ آپ کو یہ بات ایکٹ پاس کرنے سے پہلے پوچھنا چاہیے تھی اب تو آپ ایکٹ پاس کر چکے ہیں۔ اس پر سردار صاحب مختلف توجیہات پیش کرنے لگے اور پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ میں نے ان کو کہا کہ سردار صاحب اس ایکٹ کو اسمبلی سے منسوخ کرا کر یہ ساری آسامیاں مشتہر کروائیں جو لوگ آئیں گے، وہ بھی آزاد کشمیر کے ہی شہری ہوں گے، ممکن ہے یہی لوگ دوبارہ بھی منتخب ہو جائیں، آپ بدنامی سے اور سول سروس کا ڈھانچہ تباہی سے بچ جائے گا۔ میں نے سردار صاحب کی خوشامدی کی کمزوری کو ایکسپلائٹ کرتے

ہوئے کہا کہ آپ ایمان کے حوالے سے انصاف اور میرٹ کے صحیح دعویدار ہیں۔ آپ سے ایسا ہونا کوئی بھی قبول نہیں کرسکتا۔ اگر سکندر حیات صاحب، بیرسٹر صاحب یا راٹھور صاحب ایسا کرتے تو اور بات تھی وہ ان باتوں کے دعویدار نہیں جن کے آپ ہیں۔ مجھے سردار صاحب بے بس نظر آئے گو کہ انہوں نے اس غلطی کو تسلیم کیا۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا، ''اُہ سوری دے کرا گے۔''

انہوں نے اس وقت کے وزیر مرحوم ممتاز گیلانی اور محترمہ ناہید طارق جن کے ساتھ ہمارا گھریلو تعلق بھی تھا، اپنے اپنے محکموں کے حوالے سے تقرریوں کے خلاف رٹ درخواستوں میں مدد کے لیے میرے پاس بھیجا لیکن افسوس کہ میں ان کی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ سردار عتیق احمد خان نے میرے خلاف عداوت کی ٹھان لی اور 1993 سے مفروضوں اور بے سروپا الزامات پر مبنی ایک ریفرنس قائم مقام وزیر اعظم چوہدری محمد یوسف کے ذریعہ دائر کرنے کے لیے، صدر کو سفارش کردی۔ اس کی تفصیل اور دلچسپ معاملات علیحدہ ذکر کروں گا۔ گو کہ 1991 سے 1996 تک کی سردار صاحب کی حکومت کی ناکامی اور بدنامی کے ذمہ دار بالآخر سردار صاحب ہی ہیں لیکن ان کو اس حال تک اس وقت کے وزیر قانون سردار سیاب خالد، ان کے اپنے بیٹے سردار عتیق احمد خان اور اس وقت کے ہائی کورٹ کے جج ریاض اختر چوہدری نے پہنچایا، جو اس سارے عرصہ کے دوران ان کے ہم راز، ہم خیال اور مشیر خاص رہے۔

1992 کے سیلاب کی تباہ کاریوں کی وجہ سے آزاد کشمیر کی اربوں روپے کی لکڑی، بیرونی امداد اور تعمیر نو کی مد میں بجٹ بغیر کسی حساب دہی کے ہضم ہوگیا۔ کشمیر لبریشن سیل کے کروڑوں روپے کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ ادھر عتیق صاحب نے جیسے کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اپنی جماعت، دوستوں اور تعلق داروں کو نوازنے کے لیے سینکڑوں لوگوں کو آزاد کشمیر کے مختلف محکموں میں گریڈ 16 تا 20 تک ایڈہاک بنیادوں پر تعینات کرکے اسمبلی میں 1993 میں ان ایڈہاک ملازمین کی مستقل تقرری کا قانون پاس کرا لیا۔ اس کو عتیق کمیشن تقرریوں کے نام سے موسوم کیا گیا۔ آزاد کشمیر میں اس کے خلاف ایک طوفان برپا ہوگیا۔ معاملہ بالآخر عدالت میں گیا اور کئی رٹوں کے ذریعہ ان تقرریوں کو چیلنج کیا گیا۔

ایڈہاک تقرریوں کو مستقل کرنے کے ایکٹ کو علیحدہ طور چیلنج کیا گیا جس کو اس وقت کے چیف جسٹس عدالت العالیہ عبدالمجید ملک صاحب نے کالعدم قرار دیا جو ان کے تاریخی فیصلوں میں سے ایک تھا۔ باقی تقرریوں کو جو الگ الگ رٹ درخواستوں کے ذریعہ چیلنج کی گئی تھیں کو میں نے کالعدم قرار دے دیا۔ یہ سارے فیصلہ جات پاکستان کے قانونی جرائد میں رپورٹڈ ہیں۔ عتیق احمد خان اور دوسرے لوگ جن کے مفادات درج بالا فیصلہ جات سے متاثر ہوئے تھے، جسٹس عبدالمجید ملک اور میرے خلاف اسی زمانے سے کمر بستہ ہوگئے تھے۔ سپریم کورٹ میں اس وقت سردار سید محمد خان صاحب چیف جسٹس اور بشارت احمد شیخ صاحب سینئر جج تھے جو کسی دباؤ اور اثر میں آنے والے نہیں تھے۔ ان کے خلاف عتیق احمد خان نے ایک محاذ کھول دیا جس کی وجہ سے اس کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی عمل میں لائی گئی۔

عتیق احمد خان کی جان بچانے کے لیے مسلم کانفرنس کے ایک متحرک کارکن فدا حسین کیانی نے اس بیان کی ذمہ داری قبول کی جس کی پاداش میں عتیق خان کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی عمل میں لائی گئی تھی۔ چنانچہ عتیق احمد خان تو بچ گئے، البتہ فدا حسین کیانی کو توہین عدالت میں سزا ہوئی۔ یہ فیصلہ بھی رپورٹڈ ہے۔ ان حالات میں عتیق احمد خان کے عدلیہ کے خلاف محاذ کھولنے کی وجہ سے بدانتظامی اور طوائف الملوکی کو واضح فروغ ملا اور تعمیراتی کاموں میں عدم دلچسپی کی وجہ سے سردار صاحب کی ساکھ کو بہت نقصان پہنچا اور ان کا 1970 سے 1975 تک کی حکومت کا جو اچھا تاثر لوگوں کے ذہنوں میں تھا، وہ تار تار ہوگیا۔ بالآخر 1996 میں ہونے والے اسمبلی کے انتخابات میں ان کی پارٹی بری طرح شکست سے دوچار ہوئی۔ اس شکست کی ذمہ داران ان کی ناقص کارکردگی کے علاوہ ان کی پارٹی میں دھڑے بندی اور مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت کا بھی اہم کردار ہے۔